URD
891.4393016
Q15
Gh

غبارِ کارواں

(ناتمام خودنوشت)

891.4393016 URD
Q15 Gh
138751

138751

خوبصورتی سے ابھارا اور محفوظ کیا ہے۔ اسے آپ Family Saga کے طور پر بھی پڑھ سکتے ہیں اور تہذیبی اور سیاسی تاریخ کی حیثیت سے بھی۔ اس میں آپ ایک جاتی ہوئی دنیا کا حُسن بھی دیکھ سکتے ہیں اور ایک آتی ہوئی تہذیب کے قدموں کی چاپ بھی سُن سکتے ہیں۔ بیگم انیس قدوائی کے حوالے سے بات کروں تو یہ کہوں گا کہ یہ ایک ادھورا رزمیہ ہے مسلم متوسط گھرانے کی ایک عورت کا جو اپنی شناخت کے سفر پر نکلتی ہے اور طرح طرح کی مشکلات و موانع کے باوجود کامیاب و کامراں ہوتی ہے۔

'غبارِ کارواں' میں اس صدی کی ابتدائی دو دہائیاں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان دہائیوں کے ایسے جاوداں نقوش کم از کم اُردو میں مجھے کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملے۔ مجھے توقع ہے کہ اس کی دستاویزی حیثیت کے اعتراف میں مَیں تنہا نہیں رہوں گا۔

'غبارِ کارواں' کے ساتھ بیگم انیس قدوائی کے ابتدائی دَور کے مضامین کی فراہمی کے لیے میں جناب عابد رضا بیدار ڈائرکٹر، خدابخش لائبریری، پٹنہ کا ممنون ہوں۔ بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اس سلسلے میں محترمی انور جمال قدوائی اور شاہد علی خاں صاحب کی رہنمائی اور مسلسل تحریکِ عمل کا اعتراف نہ کروں۔

شعبۂ ادبیات انگریزی
جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

انور صدّیقی
۲۷ر دسمبر ۸۳ء

(۱)

بیسویں صدی کو شروع ہوئے ابھی بہ مشکل چھے سال ہوئے تھے کہ اودھ کے دو قدامت پسند خاندانوں میں ایک حادثے نے ہلچل مچا دی۔ اور یہ بھونچال صرف ایک سانولی منحنی سی بچّی کی پیدایش پر کرسطان لیڈی ڈاکٹر کی آمد سے برپا ہوا تھا۔

اس سے پہلے لاکھوں بچّے ان خاندانوں میں پیدا ہو چکے ہوں گے۔ مگر اُن نانا، دادا کی عقل اور سمجھ کو کیا کہا جائے جو ہر اعتراض کے جواب میں یہ فرما رہے تھے کہ ہم تو اپنی لڑکی اور بہو کی جان بچانے کے لیے جدید طریقِ علاج سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے۔ پرانی جاہلانہ روایات کی وجہ سے لڑکی کو موت کے حوالے نہیں کریں گے۔

اس مسکت جواب نے سب کو خاموش کر دیا اور لوگ یہ کہتے ہوئے کھسک گئے، "ہاں صاحب اپنی اولاد پر اختیار ہے جو چاہے سو کریں۔"

مگر پردہ دار بیویوں نے لیڈی ڈاکٹر کے یوں گھر میں در آنے پر اپنا ماتھا کوٹ لیا۔ بھلا غضب ہے، باہر کی پھرنے والی، مردوں سے ہنس ہنس کر ہاتھ ملانے والی یوں شریف زادیوں کے بیچ چلی آئے اور عزّت دار بہو بیٹیاں اس کے سامنے بیٹھی رہیں۔ اس کا تو دیدہ ہوائی ہو چکا ہے۔ آنکھوں کا پانی مرگیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک تو وہ مردوئے سے کم نہیں ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سوا گھر کی بزرگ بیوی کے ساری رشتہ دار عورتیں پردے میں چھپ گئیں۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ ڈاکٹرنی نے اپنے ساتھ آئی ہوئی نرس

اور کمپاؤنڈر کے سوا کسی عورت کو اندر گھسنے بھی نہ دیا۔ صرف لڑکی کی ماں کو ٹھہرنے کی اجازت دی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ۱۶ سالہ نوعمر زچّہ کے والدین نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ لوگ خوش تھے۔ مگر رشتہ ناتے والیاں موٹی ڈاکٹرنی کی عجلت پر برہم تھیں۔ ان کا خیال تھا ڈاکٹرنی جھوٹی ہے۔ آتے ہی اس نے اعلان کردیا تھا کہ کیس نارمل نہیں ہے۔

اور لیڈی ڈاکٹر فخر کے ساتھ مسکرا رہی تھی کہ اگر ان کے مضبوط ہاتھ اور نایاب اوزار نہ ہوتے، تو یہ نا معقول بچّی کبھی ماں کا پیٹ نہ چھوڑتی۔

یہ تھی میری پیدائش جو اس واقعے کی وجہ سے خاندان میں تاریخی واقعہ بن گئی تھی۔

لطف یہ ہے کہ چند ہی روز بعد یہی نگوڑی کرسٹان ڈاکٹرنی ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کا لانبا سیاہ سایہ، لیس والا سفید بلاؤز اور سفید ہیٹ لگائے ہاتھ میں بڑا سا بیگ سنبھالے ضلع کے ہر صاحب حیثیت گھرانے میں جب کب نظر آنے لگی۔ ہر وزٹ پر سو سو روپے اور علاج ختم ہونے پر بیش قیمت تحائف لے لے کر وہ اپنی جیب بھر رہی تھی۔ بارہ بنکی کے سارے تعلقدار اور رؤسا میں آئے دن اس کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ اتنا ہی نہیں اسپتال اور اس کے چند گنتی کے وارڈ مریضوں اور تیمار داروں سے بھرے رہنے لگے۔ سالہا سال تک بارہ بنکی کے اسپتال پر اس کا راج رہا۔ میں نے بھی اسے اس کی یک چشم گنوار دائی سُکھ دیئی اور چھڑے چھاگل کلیوں دار پاجامہ پہنے چھلاوا جیسی کمپاؤنڈر اور ان کی جاہل مددگار کو بیسیوں بار دیکھا۔ کھرل میں گولیاں پیستے اور پانی کی ٹنکی سے شیشیاں بھرتے دیکھیں۔ لیکن وہ دوا تھی اور فائدہ بھی ہو جایا کرتا تھا۔

(۲)

کہتے ہیں خواجہ معین الدین چشتی کے ہم راہ شہاب الدین غوری کے عہدِ حکومت میں نشتر علما اور فقرا کا ایک قافلہ جہاد فی سبیل اللہ کے شوق اور تعلیم و تبلیغ کے ارادے سے ہندستان آیا تھا۔ اس میں ایک عالم قاضی قدوۃ الدین[1] بھی تھے۔ شاہ دہلی نے شہر سے باہر جاکر اس گروہ کا استقبال کیا اور ان میں سے ذی علم افراد کو مناسب منصب و اعزاز بھی عطا کیا۔ فقرا بھلا کا ہے کو ٹکتے۔ وہ اپنے مشن میں مصروف ہو گئے اور علما اپنے کام میں۔ قاضی قدوۃ الدین ایک سال تک قاضی القضاۃ یعنی موجودہ زبان میں چیف جسٹس کے عہدے پر مامور رہے۔ بعد ازاں شاہ نے ایک ہزار فوج کے ساتھ انھیں اودھ کی طرف بھیج دیا۔ شاید یہ خطۂ ملک اس وقت چھوٹے چھوٹے راجاؤں میں بٹا ہوا تھا اور حکومت وقت کے پوری طرح تصرّف میں نہ تھا۔

قاضی صاحب نے لڑ بھڑ کر اس علاقے میں اپنی جگہ بنائی۔ بارہ بنکی گزیٹیر اور کچھ شجرۂ نسب کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب ایک رومی شہزادے اور نسلاً بنی اسرائیل تھے۔ ہندستان میں وہ مدینہ منوّرہ سے آئے تھے اور روایت ہے کہ شریف مکّہ کی بیٹی یا شیوخ عرب میں سے کسی لڑکی سے ان کا عقد ہوا تھا۔ ہندستان میں اس دور کے شیخ الاسلام کی بیٹی سے اپنے بیٹے عزیز الدین کا نکاح کیا۔ بقیہ تین بیٹوں کی شادیاں کہاں

---

[1] "معین الارواح" مطبوعہ اجمیر میں بھی قاضی صاحب کے حالات اسی سے ملتے جلتے ہیں۔

ہوئیں؟ اگر شجرۂ نسب کے کرم خوردہ اوراق موجود ہوں گے تو ان میں درج ہوگا۔ یہ ساری تفصیلات میرا موضوعِ سخن نہیں ہیں۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اودھ وہ اس فوج کے علاوہ اپنے چار بیٹوں اور دس عزیزترین معتمد غلاموں کے ساتھ آئے تھے۔ ان میں کچھ ایرانی تھے کچھ پٹھان، جنھیں فتوحات میں معتد بہ حصہ ملتا رہا بلکہ جس علاقے کو جس نے فتح کیا وہ اس کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔ انھیں دنوں سیّد سالارِ مسعود غازی اور ان کے ماموں ساہو سالار نے ستر کھ ضلع بارہ بنکی اور بہرائچ[1] کی طرف اور قاضی صاحب نے فیض آباد کا رخ کیا اور اب فیض آباد سے قریب اجودھیا میں گنج شہیداں سے متصل آسودۂ خاک ہیں۔

ان کی اولاد اور غلاموں نے ہم پلّہ زمینداریاں قائم کیں۔ بلکہ ساتھیوں نے تو بڑے قلعے بھی تعمیر کیے۔ بدّو سرائے ضلع بارہ بنکی میں ایک منہدم قلعے کے آثار اور شکستہ پھاٹک میں نے بھی دیکھے تھے۔

بہر حال قافلے آتے رہے اور اکثر ایرانی اور عربی النسل خاندانوں نے اودھ میں سکونت اختیار کر لی۔

میرے ننہالی اعزّہ میں سے ایک بزرگ جن کو اپنے شیخ صدیقی ہونے پر فخر تھا، ہم لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ ہمارے مورثِ اعلا عرب سے اپنی بیویاں ساتھ لے کر آئے تھے، مگر قاضی صاحب کے صرف ایک بیٹے کی شادی تو ضرور سادات میں ہوئی، باقی سب کی بیویاں پتا نہیں کون تھیں اور کہاں کی تھیں اور خود قاضی صاحب نے بھی تو ہندستان آکر شادیاں کی ہوں گی اس لیے تم سب دوغلے ہو اور ہمارے ہم پلّہ نہیں ہو۔

ویسے قدوائی (قاضی قدوۃ الدّین کی اولاد) اپنے کو شیخ و سیّد کی مخلوط عربی نسل بتاتے تھے۔ واللہ اعلم۔

---

[1] جہاں سالار مسعود غازی کا مزار ہے اور وہ خود ضلع ہے۔

بہر حال یہ واقعہ ہے کہ بیسویں صدی کی ابتدا سے پہلے قدوائی سوا بارہ بنکی فیض آباد و لکھنؤ کے پورے ہندستان میں کہیں نہ تھے۔ یہاں ان کی رشتہ داریاں صدیقی، علوی، فاروقی اور سادات میں ہوئیں۔ مگر کچھ خاندان ایسے تھے جنھیں وہ مغل، پٹھان یا ایرانی کہہ کر قرابت سے انکار کر دیا کرتے تھے۔ اس معاملے میں اس حد تک متعصّب تھے کہ خاندان سے اس ٹکڑے کو کاٹ کر الگ کر دیتے تھے، جس نے مخصوص عربی النسل خاندانوں سے باہر شادی کی ہو۔ اتنا ہی نہیں بندوبست اراضی میں انھوں نے غیر کفو افراد کو پشتینی جایداد کے حق سے بھی محروم قرار دے رکھا تھا۔

ہندستان کی آب و ہوا نے انھیں بالکل بھلا رکھا تھا کہ آنحضرتؐ نے حضرت زینب کا عقد ایک غلام سے کر دیا تھا۔

لطف یہ ہے کہ عربی النسل ہونے کا دعوا کرتے تھے، مگر اپنے واجب الارض میں لڑکی کو شرعی حق سے محروم کر رکھا تھا اور بیواؤں کے نکاح میں بھی شریعت اسلام کو بھول گئے تھے۔ بالکل ہندو مذہب کی طرح اپنی برادری میں بھی بیوہ کی شادی ممنوع قرار دے رکھی تھی۔ ہندو قانون وراثت سارے راجا اور مسلم تعلقداروں نے منظور کر رکھا تھا، جس کی وجہ سے صرف بڑا بیٹا گدّی نشین ہوتا تھا۔ باقی سب گزارہ دار بن جایا کرتے تھے اور بڑے بھائی کے رحم و کرم پر زندگی بتاتے تھے۔

کاکوری کے شہاب الدین صاحب نے مجھے بتایا کہ رقعاتِ عالمگیری میں لکھا ہے۔ "قدوائیاں نسب دارند حسب نہ دارند" اگر یہ صحیح ہے تو بڑی گہری نظر بادشاہ کی تھی۔

یہ واقعہ ہے کہ میں نے ذی ثروت و صاحبِ حیثیت ذرا کم ہی پائے۔ معلوم نہیں کیا بات تھی کہ خاندان کا ایک فرد اگر تموّل و تعیّش کی طرف راغب ہوتا، تو دوسرا فقر و فاقہ کو ضرور اپنا لیتا۔ بیشتر افراد کا رجحان ترک و تیاگ

اور صبر و قناعت کی طرف رہتا۔ ایسا کیوں تھا؟ شاید یہ اس درویشانہ وسپاہیانہ زندگی کا اثر تھا جو مورثِ اعلا سے ورثے میں ملی تھی۔

پاس پڑوس کے دوسرے امرا کے عالی شان محلات دیکھ کر میں نے اپنے اعزہ کی شاندار حویلیاں ڈھونڈیں، مگر معدودے چند کے سوا زیادہ تر ادھ بچے مکان یا متوسط طبقے کی پختہ حویلیاں سامانِ آرایش سے خالی نظر آئیں۔ البتہ پٹھانوں، ایرانیوں اور صدیقی، علوی، ہاشمی شیخ زادوں کی گڑھی، قلعہ، دیوان خانہ، محل اکثر قصبات میں دیکھے۔

اس میں شک نہیں اب سے ساٹھ ستر سال پہلے، کئی سو سال گزر جانے کے باوجود ان کے کردار میں عربوں کی مہمان نوازی، سخاوت، بہادری اور ایثار کے علاوہ عجیب قسم کا تفاخر بھی موجود تھا۔ شکل و صورت کے اعتبار سے بھی اونچے قد، کھلتی ہوئی رنگت اور چوڑی ہڈیوں کی بدولت کسی مخصوص نسل کی نشان دہی ہوتی تھی۔ وہ تندرست و توانا مرد اور کلّہ ٹھلّہ والی لانبی عورتیں اب عنقا ہیں۔ لیکن میں نے انھیں دیکھا تھا۔

میرا خیال ہے بکسر کی جنگ میں بکثرت قدوائیوں کی شہادت کے بعد ان کا دورِ تنزل شروع ہو گیا اور معتوبِ بارگاہ اودھ ہو کر زیادہ تر قدوائی چھوٹے زمیندار یا کاشتکار بن کر زندگی بسر کرنے لگے۔ مالی مشکلات نے جہالت بھی بڑھا دی اور کیرکٹر کا زوال بھی۔ اس کے علاوہ بڑی تیزی سے غیر کفو اولاد نے آباو اجداد کی نسلی خصوصیات بدلنا شروع کر دیں۔ علم و فضل کی کمی ہوئی تو مذہبی پختگی پر بھی اثر پڑا۔ اِدھر شاہان اودھ نے شیعہ سنی مسئلہ چھیڑ کر شاید ان کو سرکار دربار سے بھی متنفر کر دیا۔ اس دور میں وہ لوگ نہ کوئی اعلا عہدہ حاصل کر سکے، نہ فوج میں شامل ہو سکے۔ اس کا نتیجہ پستی و انحطاط تھا۔ اقتصادی، علمی، ہر قسم کا تنزل۔ اتنی خیریت تھی کہ اس دورِ تنزل میں بھی ان کی رشتہ داریاں ذی علم اور صاحبِ ثروت شیخ زادوں

کے ہاں ہوتی رہیں۔ اس لیے چند خاندان بچ گئے اور "بارہ گانو" قدوارہ سب سے بڑا بھیارہ صرف ایک مثل بن کر رہ گیا۔

بارہ بنکی ضلع کے سب گانو اب قدوائیوں سے خالی ہو چکے ہیں کیونکہ اب قبیلہ ہندستان کے بہت سے صوبوں، پاکستان اور بنگلہ دیش تک منتشر ہو چکا ہے۔

بس بڑا گانو"، مسولی، رسولی، بھیارہ، گدیہ، جگور اور دریا آباد ونواب گنج وغیرہ میں چند کنبے باقی ہیں۔ کسی قدر قبائلی خصوصیات ان میں آج بھی باقی ہیں۔ اپنے بڑے سے بڑے دشمن کی اگر وہ قدوائی ہے، تو مصیبت میں مدد کرنا، اس کے عیبوں کو چھپانا، رسوائی سے بچانا، ممکن ہو تو جرم و سزا سے بچا لینا، بلکہ اس کا انتقام لینا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

چاہے جتنی شدید مخالفت ہو لیکن شادی اور غمی میں اس کے گھر شرکت لازمی ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی ایسی لڑکی بیاہی جارہی ہو جس کے والدین میں سے ایک یا دونوں نہ ہوں تو پورے قبیلے کا فرض ہے کہ بن بلائے اس میں شرکت کرے اور حسبِ حیثیت امداد کرے تاکہ اس خاندان کو غیروں کا ممنونِ احسان نہ ہونا پڑے۔ پہلے تو غمی میں بھی امدادی قواعد مقرر تھے جواب متروک ہو چکے ہیں۔

اِن دنوں بڑے سے بڑے جرم کو وہ لوگ اس لیے چھپا لیتے تھے کہ کسی قدوائی بھائی کو جیل کی کوٹھری یا پھانسی کے پھندے سے سابقہ نہ پڑ جائے۔ حتیٰ کہ اس کی ذلت بھی دوسرے کے ہاتھوں گوارا نہ تھی۔ لیکن خود آپس میں خوب مار پیٹ کرتے۔ طوائف الملوکی کے دور میں اگر کوئی دوسرا چڑھائی کرتا تو اس کی حمایت میں کٹ مرتے، لیکن خود ایک دوسرے کی زمین ہتھیا لینے میں کوئی حرج نہ سمجھتے تھے۔ حکومت برطانیہ کے مقرر کردہ لگان کی ادائگی کا اگر کسی غریب بھائی کو یارا نہ ہوا تو اپنی جیب

سے ادا کر کے اسے قُرقی کی ذلت سے بچا لیتے تھے۔

وہ لوگ شادی بیاہ زیادہ تر اپنے کنبے برادری میں کرتے تھے اور اپنی لغزشوں کی پردہ داری اس حد تک کرتے کہ بیاہتا بیویوں کی تقدیس کو قائم رکھنے کے لیے نت نئی محبوباؤں کی ہوا بھی ان کو نہ لگنے دیتے۔ اپنی بہو بیٹی تک کو ان سے پردہ کراتے تھے اور شاذ و نادر ہی پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرتے۔ وہ بھی کسی دوسرے خاندان میں، کیونکہ قدوائیوں میں کسی کی بیٹی پر اپنی بیٹی کو سوکن بنا کر مسلّط کرنا بہت ہی معیوب تھا۔

اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ پھوپی جان کانپور جا رہی تھیں۔ بارہ بنکی اسٹیشن پر سوار ہوئیں تو دیکھا ایک رشتے کے بھائی کھڑے تھے۔ ریل پر چڑھانے سامان رکھوانے میں انھوں نے مدد کی اور چلتے وقت آہستہ سے اتنا کہا کہ بہن یہاں نقاب نہ اُلٹیے گا اس درجے میں طوائفیں ہیں۔ کہا تو انھوں نے بہت دھیرے، مگر اس شوخ و شنگ مسافرہ کے کان میں بھنک پڑ گئی، جسے سوار کرنے وہ خود تشریف لائے تھے۔ اتنا سُننا تھا کہ وہ آگ بگولا ہو گئی گاڑی چل دی، پھوپی جان نے خود کو بُرقع میں اچھی طرح لپیٹ لیا۔ مگر اس کی زبان نہ رُکی۔ لکھنؤ تک اس نے وہ بے نقط سنائی ہیں کہ پھوپی بیچاری کے پسینے چھوٹ گئے۔

وہ کہتی تھی بہن کے لیے یہ احتیاط کہ نقاب نہ اُلٹنا اور ہمارے تلوے روز چاٹنے پہنچتے ہیں۔ معلوم نہیں جب ملاقات ہوئی ہوگی تو ان بیچارے کا کیا حشر ہوا ہوگا۔

میں تاریخی حوالوں سے قصداً گریز کر رہی ہوں۔ اس پسِ منظر کے بعد وہی سنیے جو میں نے دیکھا اور میرے سامنے گزرا، یا بزرگوں سے سُنا۔

(۳)

میں پہلے بتا چکی ہوں کہ قدوائی زیادہ تر دیہات میں آباد تھے۔ چھوٹے بڑے زمینداروں کا ان دنوں ایک جال سا بچھا ہوا تھا۔ کسی کے پاس دس بیس گانو تھے، کسی کے پاس دو چار اور کسی کے پلّے چند کھیت ہی پڑے تھے۔ مگر وہ سب تعلقدار یا زمیندار تھے۔ ان میں صرف دو یا تین راجا تھے۔ کاشتکار اور کسان ہمیشہ نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور وہ سب زمیندار کی رعایا کہلاتے تھے جو ان کی جان مال، عزّت آبرو سب کا مالک ہوتا تھا۔

کچھ قدوائیوں ہی پر منحصر نہیں، وہ تو بہت تھوڑے تھے، راجپوت، برہمن اور دوسرے شیخ زادے بھی سب رؤسا تھے جو حکومت وقت کو مقررہ رقم بطور مال گزاری ادا کرنے کے بعد بلا دخل و فصل اپنی مملوکہ ریاست پر حکومت کرتے تھے۔

کچھ ایسے علاقے اور ریاستیں بھی تھیں جو انگریزوں سے وفاداری کے صلے میں عطا ہوئی تھیں۔

سارے رئیس آپس میں برادرانہ تعلقات رکھتے تھے۔ مسلمان امیر اور راجپوت زمینداروں میں اکثر گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ یہ بھی سُنا، اودھ کی سلطنت کے آخری دنوں میں یہی شیخ زادے اور راجپوت مل کر لگان وصول کرنے والے شاہی عملے کو ناکام واپس لوٹ جانے پر مجبور کر دیتے تھے، اور ان دنوں ہندو اور مسلمان زمیندار اپنے اپنے مذہب پر بے تکلّف

حملہ کر دیتے تھے۔ زمینیں چھین لیتے، لاٹھیاں، تلواریں، بلّم اور توڑے دار بندوقیں بے دریغ ایک دوسرے کے لیے پیغامِ اجل بن جاتیں، گھر کھُد جاتے۔ باغ ویران ہو جاتے اور کھڑی کھیتیاں جلادی جاتی تھیں۔ یہ روز کے کھیل تھے، کیونکہ ہر زمیندار یا علاقے کا مالک اپنی چھوٹی سی فوج رکھتا تھا یعنی اپنے ٹرینڈ سپاہی۔ میرے پردادا بھی پچاس بندوقچی اور دو زبردست پہلوان ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے تاکہ موقع پر سرکش گردنوں کو توڑ سکیں۔

شاہ اودھ کے مٹیا برُج روانہ ہونے کے بعد جب ان کو خبر ملی کہ بارہ بنکی کچہری، ٹریژری، ڈاکخانہ وغیرہ سرکاری عمارات بلوائی لوٹنے اور تہس نہس کرنے کے لیے اکٹھا ہوئے ہیں، تو مع اپنی سپاہ کے پہنچ گئے۔ ان کی بہادرانہ دھاک نے سرکشوں کے منہ موڑ دیے۔ اس لیے صرف آگ لگا کر بھاگ کھڑے ہوئے، جسے فوراً بجھا دیا گیا اور سب کچھ بچ گیا۔ مگر طرفہ تماشہ یہ ہوا کہ جب امن و امان ہوا، حکومت برطانیہ کا قبضہ مستقل ہو گیا اور سندیں اور علاقے وفاداران ازلی کو تقسیم ہونے لگے، تو دادا (شجاعت علی) نے لکھنؤ جانے سے انکار کر دیا۔ لاکھ سب نے سمجھایا، ٹس سے مس نہ ہوئے۔ یہی کہتے رہے اپنے ضلع کی بہترین چیزیں میں نے بچائی ہیں۔ کوئی انگریزوں کو بچانے تھوڑی گیا تھا جو ان سے انعام لوں۔ زمین اور جایداد تو وہی ہے جو اپنی قوت بازو سے لڑ کر حاصل کی جائے۔

انگریزی حکومت مستحکم ہوئی تو یہ افرا تفری بھی ختم ہو گئی اور اراضی کا بندوبست ہوا تو جتنا جس کے پاس تھا وہی رہ گیا۔ سوا اس کے کہ خوشنودی حاصل کر کے جو کچھ وصول کر لیا جائے۔

اس دور میں سب سے زیادہ پڑھا لکھا اور حکام رس طبقہ کایستھوں کا تھا۔ اس سے پہلے بھی ریاستوں کے دیوان، مہاجنوں کے منیم، زمینداروں کے تحصیلدار یہی لوگ تھے۔ اب پٹواری، قانون گو بھی ہو گئے۔ جایدادوں کا

حساب، مالیات کے بہی کھاتے بھی ان کے قبضے میں آ گئے۔

اس لیے برٹش گورنمنٹ کو انتظام مملکت میں ان سے بڑی مدد ملی۔ ان میں کا ہر فرد لینڈ ریونیو سے واقف، اردو، فارسی اور اب رومن رسم الخط سے بھی واقف ہو گیا تھا۔ بہت جلد انھوں نے حکومت وقت کا اعتماد، عہدہ اور قربت حاصل کر لی۔

اور رہن و بیع کی ہوئی زمینداریاں ان کے جنبشِ قلم کے رحم و کرم کی منتظر رہنے لگیں۔

(۴)

عام اصطلاح میں ہوش سنبھالنا اس دور کو کہتے ہیں، جب بچپن اور جوانی کے ڈانڈے ملنے لگتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک ایک عالم ہوش وہ بھی ہوتا ہے جب مدہوشی میں ہوش اور بے عقلی کے اندر سے عقل جنم لینے لگتی ہے۔ واقعات، حافظہ میں جگہ پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور لفظ خود غیر شعوری طور پر زبان سے ادائیگی کی کوشش کرتے ہیں۔

عمر کی اس منزل پر بیسیوں دھندلے، روشن اور متحرک سایے لاشعور میں تیر رہے ہیں۔ پہلا واقعہ جو حافظہ کے گہرے کھڈ سے نکل کر سامنے آتا ہے، وہ نواب گنج بارہ بنکی میں، میرا اپنی خالہ کے گھر قیام ہے، جہاں میں اپنی بوا (کھلائی) اور ایک پرانے ملازم کے ساتھ بھجوادی گئی ہوں۔ اور اپنی چیخ پکار کی وجہ سے باہر مردانہ صحن میں لیٹی ہوئی رو رو کر سارے گھر کی نیند حرام کر رہی ہوں۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ چھوٹا سا[1] بھیا جس کی عمر صرف تین ماہ کی ہے، شدید چیچک میں مبتلا ہے، اس لیے مجھے دیس نکالا ملا ہے۔ میری بوا اس حماقت پر بڑ بڑایا کرتی تھی، کیونکہ ان دنوں یہ بالکل نئی بات ہوئی تھی کہ کسی بچے کے چیچک نکلے اور سارے گھر کے ٹیکے لگوایے جائیں بلکہ بچّے کا ڈاکٹر سے علاج کروایا جائے اور دوسرے بچّے گھر سے دور بھگا دیے جائیں۔ ہندو، مسلمان دونوں گھرانوں میں ایسے موقع پر صدقہ خیرات، دان پن خوب ہوتا تھا مگر کسی قسم کی دوا یا احتیاط کا گزر نہ تھا۔ میرے تعلیم یافتہ باپ کی اس جدّت کو انگریزیت کے نام سے پکارا گیا تھا۔

میں نے ایسے خاندان بھی دیکھے جہاں ہر بچے کے چہرے پر گہرے گہرے داغ تھے اور ایک مریض ہوتے ہی گھر کے بیشتر افراد مرض میں مبتلا ہو جایا کرتے۔ ایک رشتہ دار تو اپنے دو بچّوں سمیت اسی موذی مرض کا ایک ہفتہ کے اندر شکار ہو گئی تھیں۔ ہندو بیویاں کہتی تھیں، چیچک میں بھوانی ماتا اپنا روپ دے جاتی ہے اس لیے صرف پوجا پاٹھ سے جائے گی۔

سین بدل جاتا ہے۔ گانو کی گلی میں کھیلتے ہوئے کوئی آکر مجھے ایک اور ننھے بھائی کی خبر سناتا ہے۔ انتہائی بے قراری سے گھر کی طرف دوڑتی ہوں جہاں پردے کے پیچھے ایک اور موٹا تازہ ننھا سا بچّہ کپڑوں میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے۔ بے تابی کے ساتھ اس پر جھک کر اپنا معصومانہ ہدیہ پیش کرنا چاہتی ہوں، مگر دو مضبوط ہاتھ مجھے پیچھے گھسیٹ لیتے ہیں۔ لڑکی، ہوش میں رہ۔ ابھی اس کو مت چھونا، اور میں روتی بسورتی پردے سے باہر نکال دی جاتی ہوں۔ بوا بیچاری ہدف ملامت بن جاتی ہے کہ اس نے کیوں مجھے آزاد چھوڑ دیا۔

لیکن شوقِ دید کسی طرح قابو میں نہ آیا اور میں نے پردے کے سوراخ

[1] مصطفیٰ کامل عرف وجو۔

کو انگلی سے بڑا کر کے غسل کا منظر دیکھ ہی لیا۔ ایک توے کو زور زور سے چمٹے سے بجایا گیا۔ باہر کسی نے بندوق سے فایر کیا۔ کھانے کے برتن میں روپیوں کی نچھاور ہوئی اور میں یہ سوچتی رہ گئی، یہ کہاں سے آیا ہے؟ بوا کہتی ہے آسمان سے گرا؟ مگر یہ جھوٹ ہے۔ پھر اتنا پیارا سا گلّو کہاں سے آیا ہوگا اور جلد ہی اندھیرے کی ایک تہ ان سب کو چھپا دیتی ہے۔ دماغ کے پردے پر ایک اور تصویر ابھرتی ہے جو میری اپنی ہے۔ صبح کا وقت ہے سورج کی کرنیں آڑی ترچھی بستر پر پڑ رہی ہیں۔ شاید رات کو میں صحن میں سوئی تھی۔ آنکھ کھلنے سے پہلے کانوں میں آواز آتی ہے۔ بس اب کلمہ پڑھ کر اٹھ بیٹھو۔ لا الہ الا اللہ کا ورد کرتی ہوئی اٹھتی ہوں تو نظر اپنے پیر کی سیاہ کھرنڈ پپڑیاں جمی ہوئی پھنسیوں پر پڑ جاتی ہے۔ شبنم کے اثر سے بدن دکھ رہا ہے مگر میں نے تہیہ کر لیا ہے یہ سارے کھرنڈ مٹا کر رہوں گی۔ طبیعت میں ہیجان سا پیدا ہوتا ہے بڑی لگن و تندہی سے ان سب کو ادھیڑنا شروع کر دیتی ہوں۔ یہ کام کوئی بہت آسان تو نہ تھا۔ کافی محنت طلب اور تکلیف دہ بھی۔ ہونٹوں کو ایک خاص انداز سے سکیڑ کر مردانہ وار اس کام میں مصروف ہو گئی۔ سب اصرار کر رہے ہیں کہ کسی طرح بستر چھوڑ۔ واہ ری لڑکی آج اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ لیکن میں غنچہ دہن بنی ہوئی بدستور پھنسیوں کی صفائی میں مصروف ہوں۔ آخر ماں کی تیز نظر تہ تک پہنچ گئی۔ ہاتھ پکڑ کر بستر سے گھسیٹ لیتی ہیں۔ اور میں روتی گھسٹتی، خونم خون ٹانگیں لیے دھلوانے اور دوا لگوانے جا رہی ہوں۔ ۲۱ سالہ کم سِن ماں کیسے تین تین بچّوں کی خبر لے۔ لامحالہ جاہل نوکر، نوکرانیوں پر بھروسا کرنا پڑتا تھا۔

واقعات گڈمڈ ہو کر ایک اور ہیولیٰ نظر کے سامنے لاتے ہیں۔ شام کا جھٹپٹا وقت ہے۔ نرگس (کنیز) ایک مٹی کے سکورے میں چند انگارے ان پر لوبان ڈالتی ہوئی میرے ننھے بھائی کی طرف جاتی ہے۔ بچّہ گبھے پر

لیٹا ہوا سو رہا ہے۔ نرگس کو قاعدے کے مطابق اس دھویں کو جو لوبان سے اُٹھ رہا ہے، سات مرتبہ بچے کی طرف ہاتھ سے منتقل کرنا ہے۔ یہ لوبان کوئی پیر صاحب یا سیّد صاحب دعائیں دم کرکے بھیجتے تھے اور پانچ ماہ تک روزانہ مغرب کے وقت ہر بلا و آفت سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی دھونی بچے کو دی جاتی تھی۔

نرگس ایک دو بار ہاتھوں کی حرکت سے دھواں بچے کی طرف پھینکتی ہے اور پھر نہ جانے کیا ہوتا ہے کہ بھیّا اور ماں دونوں چیختی ہیں۔ وہ دوڑتی ہوئی آئیں اور ہاتھوں سے اُٹھا اٹھا کر انگارے ننھے بچّہ کے جسم سے ہٹانے لگیں۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا، تڑپ رہا تھا۔ پیٹ اور ٹانگیں بُری طرح جل گئی تھیں۔ نرگس چور بنی ہوئی ستون سے لگی کھڑی تھی جسے میں نے بھی کھسوٹا، کسی نے اس پر دھپ لگائی اور چند جوتیاں بھی اس پر پڑیں۔ غرض بچاری کی اچھی طرح پٹائی ہوگئی جس سے مجھے بہت دکھ ہوا۔ کیونکہ کچھ بھی ہو وہ میری ہی دریافت تھی اور اس پر مجھے فخر تھا۔

بہرحال اس واقعے کے بعد ہم لوگ ضلع کے صدر مقام بارہ بنکی منتقل ہو گئے۔ جہاں کافی دنوں تک بھیّا کا علاج ہوتا رہا۔

(۵)

غالباً ۱۹۰۶ء میں میرے والد ولایت علی، علی گڑھ سے ال۔ال۔بی کرکے واپس آئے اور بارہ بنکی میں وکالت شروع کی۔ اس سے تقریباً دو سال پہلے ان کے پھوپھی زاد بھائی نواب علی صاحب[۱] وہاں وکالت شروع کرچکے تھے۔

[۱] جو میرے خالو بھی تھے۔

نواب گنج بارہ بنکی ضلع کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے ہمارے دیہات کے مقابلے میں خاصا ترقی یافتہ شہر تھا (اگرچہ اب وہ قصبہ لگتا ہے) وہاں زنانہ مردانہ اسپتال کے علاوہ، ہائی اسکول اور پرائیویٹ مڈل اسکول بھی تھا زیادہ تر اَپر مڈل کلاس کے لڑکے یہیں پڑھنے آتے تھے۔ گانو کے مکتب یا اسکول سے پرائمری تک پڑھنے کے بعد یا گھر پر اردو فارسی اور کلامِ پاک پڑھانے کے بعد لڑکوں کو اس گورنمنٹ اسکول میں داخل کر دیا جاتا۔ یہاں تعلیم تیسری کلاس سے شروع ہوتی تھی، اور کوئی بچہ آٹھ سال سے پہلے اسکول میں داخل نہیں ہوتا تھا بلکہ اکثر دس بارہ برس کے لڑکے داخلہ لیتے تھے۔

مکتب میں کسی مذہبی تخصیص کے بغیر ہندو لڑکے مسلمان مولویوں سے اور مسلمان بچے گروجی سے ہندی، اردو، فارسی، حساب سب پڑھتے تھے۔ البتہ لڑکیوں کو لکھنا نہیں سکھایا جاتا تھا، صرف اس لیے کہ کسی غیر کو خط نہ لکھ بیٹھیں۔ تحریر پر بھی نظر پڑنا بزرگوں کو گوارا نہ تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم زیادہ تر مذہبی ہوتی تھی۔ زیادہ پڑھنے سے یہ اندیشہ بھی تھا کہ عاشقی معشوقی نہ کرنے لگیں۔

عموماً مسلمان لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں قرآن شریف ناظرہ، میلاد شریف کی کچھ مُروّجہ کتابیں اور راہِ نجات شامل تھیں۔ ہندو لڑکیوں کو رامائن و مہابھارت کا مختصر حصّہ، کچھ منتر، مذہبی برت اور تہوار کے طریقے، دیو مالا کی کچھ کہانیاں زبانی بتا کر تعلیم ختم کر دی جاتی تھی۔

ان میں سے لکھنؤ کی رہنے والیاں اکثر اردو پڑھنے اور شعر و شاعری کا ذوق بھی رکھتی تھیں۔

اودھ کے دیہات کی زبان نہ ہندی تھی، نہ پراکرت، نہ برج بھاشا۔ اودھی زبان میں بکثرت سنسکرت اور فارسی کے الفاظ اپنی بگڑی ہوئی شکل

میں شامل تھے۔ یہ زبان لکھنے پڑھنے کی بالکل نہ تھی، نہ اس کا کوئی خاص رسم الخط تھا۔ گیت، بھجن اور دوہے اردو رسم الخط میں بھی لکھے جاتے تھے اور دیوناگری میں بھی، اور شاید اس زبان کے بوجھ کو دیو ناگری رسم الخط ہی سنبھال سکتا تھا کیونکہ ش، ق، ز، ض وغیرہ کی آوازوں کو اتنا توڑ مروڑ کر استعمال کیا جاتا تھا کہ اردو رسم الخط اس کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن ہمارے گھروں میں یہی زبان بولی جاتی تھی۔ اسی میں گیت گائے جاتے تھے اور اسی میں آلھا اودل کا رزم نامہ ڈھول مجیرے کی تال پر سنایا جاتا تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ اردو کے باذوق افراد گیت بھی لکھتے تھے اور بہترین ہندی داں پنڈت اردو شاعری پر سر دھنتے تھے۔ قوالی، بھجن اور جامی کا نعتیہ کلام سننے والوں کی محفلیں مشترکہ ہوتی تھیں۔

بیسویں صدی شروع ہوتے ہی ہر گھر میں، وکیل، بیرسٹر اور ڈاکٹر نظر آنے لگے، مگر بابو ابھی تک بنگالی ہی ہوتا تھا کیونکہ کلرکی تھرڈ کلاس چیز سمجھی جاتی تھی۔ سرکاری نوکری باعثِ اعزاز تھی، مگر شرفا اب بھی نوکری کو خلافِ شان ہی سمجھتے تھے اور بچاکھچا اثاثہ بیٹھ کر کھا رہے تھے۔ ریل چل چکی تھی۔ لیکن میں نے ایسی بہتری خواتین دیکھیں، جنھیں صرف ایک بار چڑھنے کا ارمان تھا۔ عموماً اودھ کے شریف زادے تیس چالیس میل کا سفر گھوڑا گاڑی پر طے کیا کرتے تھے۔ عورتوں کا سفر بے پردگی کے خیال سے ذرا کم ہی ہوتا تھا۔ بند بگھی کی جھلملیاں کس کر عورتوں کو سفر کرایا جاتا تھا۔ شوہروں کی ملازمت پر بیویوں کا ساتھ ساتھ گھومتے رہنا بھی ضروری نہ تھا۔

مسلمانوں میں پیروں اور پیرزادوں کی اور ہندوؤں میں برہمنوں کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

(۶)

میرے دادھیالی اور نانہالی دونوں گھرانے زمینداروں کے تھے مگر دونوں میں عظیم فرق شاید میری نانی کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ وہ لکھنؤ کی شیخ زادی تھیں اور اس خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جنھیں چھیڑنا شاہان وقت مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ جب اودھ میں شیعہ مذہب کا زور ہوا تو شاہ اودھ[1] نے تمام ماتحت راجاؤں اور تعلقہ داروں کو اس پر مجبور کیا کہ وہ اس طریقِ مذہب کو اختیار کر لیں۔ ظاہر ہے یہ بڑی سخت بات تھی۔ عام بغاوت کا خطرہ پیدا ہو گیا اور تب مشیرانِ حکومت نے مصالحت کا یہ راستہ نکالا کہ رعایائے شاہ چاہے شیعہ فقہ پر عمل نہ کرے، مگر غمِ حسین میں "تعزیہ داری" قائم و مجلس پر متفق ہو جائے۔

اس پر رؤسا اور عوام سب نے ہامی بھر لی۔ لیکن شیخ زادوں میں بہت سے خاندان ایسے تھے جو رسول اللہ اور اہل بیت اطہار سے شدید محبت رکھنے کے باوجود تعزیہ داری و ماتم پر راضی نہ ہوئے اور ترک وطن کر کے الور، جے پور، پٹیالہ اور دہلی کی طرف کوچ کر گئے، مگر اپنا طریق نہ بدلا۔

میری نانی بڑی فصیح اردو بولتی تھی۔ دورانِ گفتگو۔ "فرض کردم، دستِ بخیر، لہٰذا، گویا وغیرہ الفاظ بولا کرتی تھیں۔ بڑی لحن سے میلادشریف

---

[1] شاہ مجھے یاد نہیں محمد علی یا امجد علی شاہ

پڑھتی تھیں۔ ہزاروں دوائیں اور دعائیں انھیں ازبر تھیں اور حُسنِ انتظام، خوش سلیقگی اور قابلیت کی وجہ سے گرد و نواح کی خواتین میں ذرا ممتاز مقام رکھتی تھیں۔ ان کو اپنے صحیح النسل شیخ صدیقی ہونے پر فخر تھا۔ اکثر اپنے خاندانی علم و فضل کا (جواب قصۂ ماضی تھا) اپنے الور اور جے پور وغیرہ کے وزیر اور دیوان وغیرہ رشتہ داروں کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ (ایک دیوان صاحب کے بیٹے کو میں نے بھی دیکھا، بالکل جے پور ریاست کے کوئی شاندار نواب معلوم ہوتے تھے اور صرف "پدرم سلطان بود" کے سہارے جی رہے تھے) نانا جان قدوائی تھے، نانی جنھیں ہم سب امی جان کہا کرتے تھے، ان کے رہن سہن اور لباس میں بھی لکھنوی نفاست و ترتیب کا حُسن موجود تھا۔ شریعت و بدعت کا فرق انھیں معلوم تھا۔ مذہبی پختگی کے باوجود انتہائی غیر متعصب و ہمدرد! مگر دادھیال والے، پڑھے لکھے ہوتے ہوئے بھی خالص اودھ کے دیہاتی تھے۔ راجپوتوں کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ پنڈتوں سے مؤدبانہ برتاؤ اور رسم و رواج میں کھری ہندستانیت تھی۔ چونکہ ان دنوں شعر و شاعری کا ذوق عام تھا، اس لیے کچھ رسائل مثلاً گلکدہ، مخزن، پیامِ یار وغیرہ میں نے اپنے دادا کے ذخیرۂ کتب میں دیکھے۔ سنا ہے خود بھی شعر کہتے تھے۔ پیروں، پیرزادوں، عرس، میلے میں شرکت اور قوالیوں سے انتہائی شغف ہونے کی وجہ سے تصوّف کی طرف جھکاؤ زیادہ تھا۔ وہ لوگ بڑے مرنجاں مرنج تھے۔ سخت مذہبی ہوتے ہوئے بھی ہندستان کے تہوار، موسم اور رسومات پر فدا تھے اور خالص اودھی زبان بولتے تھے۔ دادا (ممتاز علی) شاید اپنے دور کی روشن خیال ہستیوں میں سے تھے، اس لیے اپنے دونوں بیٹوں کو اسکول و کالج میں تعلیم دلوائی۔ اپنی لڑکی کو بھی لکھنا پڑھنا سکھایا اور کنبے کے دوسرے لڑکے لڑکیوں کو بھی حصولِ علم کی طرف راغب کیا۔

دادھیال میں خوب زور شور سے محرّم منایا جاتا۔ مجلسیں ہوتیں۔ نوحے اور مرثیے پڑھے جاتے اور میرے دادا مرحوم دس دن روزے سے رہتے۔ بیٹے بھی آخری دنوں کا روزہ رکھتے۔ عید، بقرعید تو خیر اپنے تہوار تھے۔ بسنت اور ہولی، دیوالی بھی گاتے بجاتے جشن کے ساتھ اختتام پذیر ہوتے تھے ہندو رعایا کی تالیفِ قلب کے لیے گائے کی قربانی کبھی نہیں ہوئی۔ بھیڑ بکرے کٹتے اور گوشت خور ہندو رعایا بھی اس میں حصہ دار ہوتی تھی۔ میلاد مجلس کے موقع پر شیرینی کی عام تقسیم کے لیے ہندو مسلمان دونوں حلوائی مٹھائی بناتے تاکہ کسی کو لینے میں اعتراض نہ ہو۔ دوسرے زمینداروں کے برخلاف لگان کے علاوہ فاضل رقومات اور بیگار کا طریقہ بھی انھوں نے اپنے یہاں بند کردیا تھا، لیکن عورتوں میں جہالت بہت تھی۔ طرح طرح کی فضول رسومات، توہمات، تعویذ، گنڈے، مزارات پر چڑھاوے ہمارے یہاں رائج تھے۔ شادی کی پُرلطف رسموں کے علاوہ پردے کی سختی بھی یہاں کم تھی۔

نانہال میں تو پانچ سال کی عمر سے لڑکی پردے میں بیٹھ جاتی تھی مگر میں یہاں نو دس سال تک اندر باہر پھرتی رہی۔ وہاں دو قدم بغیر ڈولی یا کسی سواری کے جانے کی اجازت نہ تھی۔ یہاں چادر اوڑھ کر پورے محلے کا دن میں اور رات میں سارے گانو کا گشت کیا جا سکتا تھا۔ وہاں سگے چچازاد بھائی سے بھی پردہ تھا۔ یہاں دور کے رشتہ دار بھی بھابھی، چچی، ممانی کہتے ہوئے گھر کے اندر آجایا کرتے تھے، حالانکہ دونوں خاندان قدائیوں کے تھے۔

(۷)

تین سال کی عمر سے مجھے گھٹنوں پر تعظیماً جھک کر سلام کرنا اور نام پوچھنے پر یہ جواب دینا سکھایا گیا تھا "اس ناچیز کنیز کو انیس فاطمہ" کہتے ہیں۔ یہ سب اُپج امی جان کی تھی۔ یہ جملہ بھی شاید بھول چکا ہوتا اگر سالہا سال بعد میرے والد کے ایک گم شدہ دوست کا خط نہ آتا۔ انھوں نے پوچھا تھا کہ اب وہ مہذب لڑکی کیسی اور کتنی بڑی ہے جو یہ جملہ بہت ہی تہذیب و انکسار کے ساتھ کہا کرتی تھی۔ غالباً وہ حیران رہ گئے ہوں گے، جب انھیں اطلاع ملی ہوگی کہ اب اس کی شادی بھی ہو چکی اور وہ شاید ایک بچّے کی ماں بھی ہے۔

بہرحال تمیز و تہذیب کے یہ سارے سبق مجھے اپنی نانی سے ملتے تھے کیونکہ میں صرف ان کی چہیتی تھی۔ کھِلے ہوئے پھول جیسی خوبصورت ماں، دو اور قبول صورت بچّوں کو جنم دے چکی تھیں اس لیے مجھ سانولی جھگڑالو لڑکی کی طرف ان کی توجہ بہت ہی کم تھی۔ شاید اس کی یہ وجہ بھی تھی کہ میری اور ان کی عمر میں صرف سولہ سال کا فرق تھا اسی لیے ابھی میرے لیے مادرانہ شفقت کا جذبہ ان میں پیدا نہ ہوا تھا، جسے بڑے ہو کر میں نے محسوس کیا۔ اتنی کم سِن ماں بھلا بچّوں پر کیا رعب جماتیں۔ ویسے میں اس عمر میں بلا کی ضدی، سرکش اور سر پھری بھی تھی۔

پانچواں سال شروع ہوتے ہی ایک نئی مصیبت سر پر آ گئی۔ وہ

روایتی بسم اللہ تو میری نہیں ہوئی جس میں چاندی کا قلم، چاندی سے منڈھی ہوئی تختی ہو، چاندی کی دوات اور سنہرے پانی سے سبز تختی پر لکھی ہوئی بسم اللہ ہوتی تھی۔ بس ذرا امی جان نے اچھے سے کپڑے بنا دیے تھے۔ مولوی صاحب کو بسم اللہ پڑھائی کا نیگ مل گیا اور سارے گھر نے بتاشے کھا لیے۔

لیکن دوسرے ہی دن سے پڑھائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ استاد مولوی خلیل اٹھارہ سال ایک پرائمری اسکول کے مدرّس رہنے کے بعد ریٹائر ہوئے تھے، اس لیے ان کی قینچیاں اب بیک وقت اردو اور قرآن شریف مجھے پڑھانے لگیں۔ جب کلام پاک ختم ہو گیا تو روزانہ دو سیپارے سنے بغیر مولوی صاحب جان نہیں چھوڑتے تھے۔

گانو کی ہم عمر لڑکیاں، اپنے استادوں کو چوتھائی سیپارہ سنا کر کھیل کود میں لگ جاتی تھیں، مگر یہاں صبح سے دوپہر تک اور بعد ظہر سر شام تک مستقل گھسائی تھی۔ کبھی تختی پر خوش خطی لکھائی جا رہی ہے، کبھی پہاڑے یاد ہو رہے ہیں، کبھی ضرب تقسیم کا فارمولا سمجھایا جاتا اور ۹ نو سال کی عمر "آمدن مصدر آنا" بھی شروع ہو گیا۔ رٹ رٹ کر پورا آمد نامہ حفظ کرنا پڑا۔

صبح سورج نکلتے ہی مولوی صاحب آجاتے اور مکتب جم جاتا جس میں ہم صرف دو لڑکیاں تھیں۔ تیسری بندریا جیسی زبیدہ بہت بعد کو داخل ہوئی۔ باقی سب لڑکے تھے۔ پڑوسی وکیل صاحب کی بیٹی رام کلی مولوی صاحب سے ہندی پڑھتی تھی۔ ہماری دوستی بھی خوب تھی۔ وہ مجھے ہر تہوار پر اپنے گھر لے جاکر خوب پکوان کھلاتی تھی، لیکن میرے گھر کبھی کوئی چیز نہ کھاتی۔ شاید جھل لیتی تھی۔

کیا شاندار مکتب تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ لڑکوں میں سے ایک "شترِ بے مہار" جیسا بہت لانبا لڑکا جھوم جھوم کر پڑھتا:

ما سقیانِ کوئے دلداریم
رُخ بہ دنیا و دیں نمی آریم

دسرا آواز لگاتا:

کریما بہ بخشائے برحالِ ما
کہ ہستم اسیرِ کمندِ ہوا

رام کلی کہتی:
جاکو راکھے سائیاں مار سکے نا کوئے

تیسرا ہِل ہِل کر پڑھتا:
الف زبر آ، بے زبر با

اور مولوی صاحب فوراً ٹوکتے۔ ارے صرف زبر تھوڑی ہے۔ اتنا لمبا کیوں کھینچ رہا ہے۔ کسی طرف سے آواز آئی، "قل یاایہا الکافرون" اور میرا بھائی پوچھتا۔ مولوی صاحب شیر بورے میں کیسے گھس گیا۔ لیکن وہ باتونی زبیدہ پڑھتی لکھتی کچھ نہیں تھی۔ چپکے چپکے کہتی۔ "آج میرے ابا ایک پنکھا لائے ہیں جو اپنے آپ چلتا ہے، تمھیں دکھاؤں گی اور میں انجمن حمایتِ اسلام کے فارسی کورس کی شاید تیسری کتاب کے ورق الٹتی

شنیدم کہ شاپور دم درکشید
چو خسرو برآمش قلم درکشید

اُدھر مولوی صاحب نے کسی کو گھونسا رسید کیا۔ کسی کا اونٹ کی طرح اٹھا ہوا سر زور سے جھکا دیا۔ کسی پر کتاب یا کاپی پٹخ دی۔ کسی کو سبق دیا اور کسی کا آموختہ سنا۔

گلستاں بوستاں، مولوی اسماعیل میرٹھی کی اردو ریڈر، انجمن حمایتِ اسلام کا اردو فارسی کورس۔ ورنا کیولر اسکولوں کی ہندی ریڈر۔ پہاڑے، اڈھے پونے، حساب سب کچھ بیک وقت اس مکتب میں چلتا تھا۔ اب یاد کرو تو سمجھ میں نہیں آتا کہ جب شام کو پیدل چل کر دو کوس دور مولوی صاحب

اپنے گھر رسولی پہنچتے ہوں گے، تو دماغ بالکل چوسی ہوئی گنڈیری بن چکا ہوتا ہوگا، اور اللہ جانے کیسے اِس سوکھے چھوہارے کو ان کی بیوی تازہ دم کرکے دوسرے دن پھر بھیج دیتی ہوں گی اور اتنی محنت کا شاندار معاوضہ بھی سُن لیجیے۔ ہمارے گھر سے انھیں صرف پانچ روپے ماہوار اور کھانا ملتا تھا۔ باقی طالب علم ایک روپیا یا دو روپے ماہانہ دیتے تھے۔ بقول نظیر اکبرآبادی "وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں؛ ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی۔ عید اور بقرعید میں البتہ جب وہ خوبصورت لال، ہرے پیلے روغنی پیپر پر اپنے ہاتھ سے خوبصورت لکھے ہوئے اشعار والی عیدی ہم سب کو دیتے تھے، تو سب حسبِ حیثیت انھیں خوش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کتنا انتظار ہمیں اس رنگین پیپر کا رہتا تھا۔ وہ اشعار بھی ہم میں سے بہتوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ ہمارے والدین پڑھتے تھے۔

فارسی پڑھنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اس کے بغیر میں امی جان جیسی فصیح اردو نہ بول سکتی تھی۔ ادھر ماں کی خواہش مستزاد کہ قرآن شریف سمجھ کر ترجمہ سے پڑھا جائے۔ توتے کی طرح رٹ لینے سے کوئی فایدہ نہیں مگر مشکل یہ تھی کہ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ سمجھنا ہی "پیچ دماغ میرے کے اور اوپر عقل میری کے" بھاری تھا۔

خیر صاحب "ہر سر اولادِ آدم ہرچہ آید بگذرد"۔ وہ پروگرام تو چند سال کے لیے ملتوی ہو گیا، مگر ایک دوسری بلا سر پڑ گئی۔ یہ ایک لمبے تڑنگے یک چشم ماسٹر صاحب تھے جو ہر روز سہ پہر کو نازل ہو جاتے۔ خیریت یہ تھی کہ چچیرے بھائیوں، رشتہ داروں کی ایک فوج موجود تھی اور بچارے ماسٹر کو ان سب بدانگے لڑکوں سے نمٹنا تھا۔ لڑکی صرف میں اکیلی تھی۔ ماسٹر صاحب مجھ پر وقت بھی کم صرف کرتے تھے اور کچھ رعایت بھی کر جاتے تھے، یا شاید لڑکیوں کے لیے وہ انگریزی پڑھنا ضروری نہ سمجھتے

ہوں گے۔

کچھ بھی ہو، اس کا نقصان تو مجھے بعد کو بھگتنا پڑا۔ لیکن اس وقت ان کی لاپروائی بہت اچھی لگتی تھی۔

میں پہلے بتا چکی ہوں کہ میرے مزاج میں کسی قدر سرکشی اور بغاوت تھی۔ جو پابندیاں اب عمر کے ساتھ ساتھ عائد ہوتی جا رہی تھیں، ان سے جلی کڑھی الگ بیٹھی رہتی تھی۔

امی جان بڑے پیار سے سمجھاتی تھیں۔ میری جان! تمہاری ماں نے تو پانچ سال کی عمر سے پردہ شروع کر دیا تھا اور پھر کبھی ڈیوڑھی سے باہر قدم نہیں رکھا۔ تم ماشااللہ اب آٹھویں سال میں ہو۔ قرآن شریف پڑھتی ہو۔ دیکھو یوں سر سے دوپٹا اوڑھ کر دُہرا آنچل لے کر گردن میں گرہ لگا لیا کرو تاکہ سر نہ کھلے اور میں نانی دادی کی آنکھ سے اوجھل ہوتے ہی اوڑھنی کا بکل کھول چٹیا لہراتی ہوئی بھائیوں کے ساتھ کدکڑے لگانے لگتی۔

"ناچیز کنیز..." والا سبق جلد بھول گیا، یونہی پیشانی پر ہاتھ مار کر "تسلیم" کہہ بھاگ کھڑی ہوتی۔ مسلمانوں میں ان دنوں اودھ میں سلام علیکم کا رواج کم تھا۔ سلام، تسلیم، آداب، کورنش، لکھنؤ سے چل کر گانو تک پہنچے۔ یہ تو خدا بھلا کرے علی گڑھ محمڈن کالج کا کہ سلام علیکم پھر یاد آگیا۔ بزرگ میرے نوعمر والدین کو سمجھاتے تھے کہ بیٹی ذات ہے، اِسے دوسرا گھر آباد کرنا ہے۔ خوب دبا کر رکھو ورنہ پچھتاؤ گی۔ مگر کیا پیارے والدین تھے، سنتے سب کی تھے اور مجھ کو بھی نرمی سے سمجھا بجھا دیا کرتے تھے کہ تمیز و تہذیب سے گری ہوئی کوئی بات نہ کروں بلکہ اُٹھنا، چلنا، دوسروں سے ملنا، بات کرنا سب کچھ مجھے سیکھنا تھا، کیونکہ ان دنوں سب کے مقررہ قواعد تھے۔

یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ اپنے باپ کی وکالت کے صدقہ شہر[1] میں

---

[1] بارہ بنکی جو آج تک شہر نہ بن سکا۔

رہ رہی تھی اور سب نانیاں دادیاں یہاں سے نو دس میل پرے تھیں۔ سال میں دو تین بار آٹھ کہاروں کی پالکی پر (جب کہ دو سپاہی داہنے بائیں دوڑتے ہوئے ساتھ ہوتے۔ جن کے ہاتھوں میں تیل پلائی ہوئی لانبی لانبی لاٹھیاں ہوتی تھیں) وہ ہمارے گھر آیا کرتی تھیں اور سال میں ایک بار گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم سب اپنی ماں کے ساتھ ڈیڑھ دو ماہ کے لیے ننھیال ددھیال جایا کرتے تھے، تب ہی نصیحت فضیحت سے واسطہ پڑتا تھا۔ میں پہلے بتا چکی ہوں، دیہات میں برقع کا رواج ذرا کم ہی تھا لیکن اونچے گھرانوں میں پاس پڑوس میں جانے کے لیے یہ عجیب طریقہ تھا کہ نوکرانیاں دونوں طرف چادروں کی قنات سی بنا کر کھڑی ہو جاتی تھیں اور بیویاں درمیان سے گزر کر مطلوبہ جگہ تک پہنچتی تھیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر نوکرانی کے ہاتھ سے چادر چھُٹ گئی اور کوئی "شامت زدہ رہ گیر ادھر آنکلا" اور بیویاں تو تیزی سے دوڑ کر آگے نکل گئیں، لیکن میری ماں "نورجہاں" نہ تھیں جو گولی چلا دیتیں۔ ان کے قدم زمین میں گڑ گئے۔ نگاہیں حیا سے جھک گئیں اور جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اب میں سوچتی ہوں، کیا یہ شرم حقیقی تھی؟ مصنوعی تھی یا خوف؟ شاید پنجرے میں مقید پر کٹے پرند کی طرح ان کی طاقت پرواز ہی زائل ہو چکی تھی۔

اسے مذہبی کہیے یا روایتی، پردے کے معاملے میں نہ جانے کیوں لڑکیوں پر بہت سختی تھی۔

ان کے لیے سونے جاگنے، کھانے کپڑے تک کے قاعدے مقرر تھے۔ میں تو خیر چوڑی دار پاجامہ، فیشن ایبل قمیص اور پہنے ہوئے ڈھیلے ڈھالے کرتے اور پاجاموں میں شادی سے پہلے وقت گزارتی رہی۔ کوئی تنگ کپڑا جس سے جسم کی ساخت نمایاں ہو سکے یا گوٹے پٹھے، جڑاو زیورات پہننے کی ان کو اجازت نہ تھی۔ اس دور کے

بزرگوں کا خیال تھا کہ کنواری لڑکیاں جتنی ہی سادی اور بے ہنگم رہیں گی، دلہن بن کر اسی قدر زیادہ اچھی لگیں گی۔ بناؤ سنگھار تو صرف شوہر کے لیے کرنا چاہیے۔ دن کے وقت ہونٹوں پر پان کی سرخی اور خوشبو صرف شادی شدہ عورت کا حق تھا۔

حد ہے کہ سودا سلف بیچنے والیوں اور باہر پھرنے والیوں تک سے لڑکیوں کو پردہ کرایا جاتا تھا۔ اس لیے کہ وہ دوسرے گھروں میں جا کر ان کی صورت شکل اور عادات و اطوار کا کہیں ذکر نہ کر دیں۔ اس میں کچھ فوائد بھی تھے۔ مثلاً میرے نانا جیسے خوبصورت آدمی کی شادی کسی طرح بھی نانی جان سے ہو نہیں سکتی تھی اگر اس گورے چٹے خاندان کو یہ معلوم ہو جاتا کہ گہرے سانولے رنگ پر چیچک کے اتنے گہرے بدنما داغ ہیں۔ توبہ توبہ، میں ان موتیوں کی طرح چھپی ہوئی مقدس ہستیوں کی شکل و صورت کا ذکر لے بیٹھی۔ اللہ معاف کرے۔

بہر حال میں ان پابندیوں سے محفوظ تھی۔ ویسے میری ضدی اور آزاد طبیعت انھیں بغیر تاویل و بحث کے قبول کرنے پر آمادہ بھی نہ تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ اُچک کر مت چلو، جھکی رہو، مردوں کی طرح سینہ تان کر چلنا عورتوں کو زیب نہیں دیتا۔ ہر وقت یہ احساس سر پر مسلط رہتا کہ تم لڑکی ہو۔ درخت پر چڑھنا، گیند کھیلنا، دیوار پر سے کودنا، تنہا کہیں جانا یہ سب لڑکوں کو شوبھا دیتا تھا۔

لڑکے مزے سے ناولیں، داستانیں، دیوان پڑھتے، چھپ کر حقہ سگریٹ پیتے۔ فلش، رمی اور شطرنج کھیلتے اور من مانے دوست احباب پیدا کرتے تھے۔

ان کے سارے کرتوت مائیں چھپا ڈالتیں کہ باپ دادا کے کان میں بھنک نہ پڑے۔ ویسے ان دنوں ۱۴ سال کی لڑکی اور اٹھارہ سال

کا لڑکا جوان سمجھے جاتے تھے اور اس نو عمر نوجوان کو گھر بلکہ گھر سے باہر بھی رنگ رلیاں منانے کا موقع دے دیا جاتا تھا۔ بہت محتاط والدین بیس سال تک پہنچنے سے پہلے ان کی شادی بھی کر دیتے تھے۔ بہر حال جب ڈانٹ پڑتی تو مجھے اپنے لڑکی ہونے پر شدید غصہ آتا۔ دل چاہتا اپنی کایا پلٹ دوں اور ثابت کر دوں، میں کسی بات میں لڑکوں سے کم نہیں ہوں۔ مگر جب لڑکوں میں گھونسے لاتیں اور ہاکی سے مار پٹائی ہونے لگتی اور اس جنگ و جدل کے وقت بھی وہ پیار سے مجھ سے کہتے "بٹیا تم ہٹ جاؤ ورنہ چوٹ لگ جائے گی۔ اس پاجی کو ہم آج مزہ چکھا کر رہیں گے"، تو میں شکر بھیجتی۔ چلو اچھا ہے۔ لڑکی ہونے کے کارن بھلا میرے سر پیر تو محفوظ ہیں۔

جب میں ننہال یا ددھیال جاتی تو وہاں ہر وقت احکامات ملتے۔ کھڑے ہو کر پانی پینا منع ہے۔ جب بزرگ بات کر رہے ہوں تو بیچ میں لقمہ دینا منع ہے۔ دوسرے کی کنگھی کرنا منع ہے۔ دانت سے ناخون کترنا منع ہے۔ بدھ کو سفر کرنا منع ہے۔ جس عورت کے بچے نہ جیتے ہوں اس سے گلے ملنا منع ہے۔ اللہ جانے ممنوع باتوں کی کتنی لانبی فہرست تھی۔ اس میں صرف ایک بات کا جواب مجھے ملا کہ روزہ دار کے سامنے کھانے پینے کی رسول اللہؐ نے ممانعت کی ہے۔ باقی کے متعلق شاید بزرگوں کا مبلغ علم خود محدود تھا۔ انھوں نے خود سنی سنائی بات دہرا دی تھی۔ توجیہہ کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔ لیکن میں نے خود تحقیق کی تو پتا چلا کہ سر کے امراض، خشکی اور بال خورہ وغیرہ سے بچنے کے لیے دوسرے کی کنگھی کا استعمال یہ کہہ کر منع کر دیا گیا کہ آپس میں لڑائی ہو جائے گی۔ دانتوں سے ناخون کترنے سے برص کی بیماری پیدا ہونے کا ڈر رہتا ہے اور سوکھے کی بیماری سے مرنے والوں بچوں کی ماں اکثر خود امراض کی پوٹ ہوتی ہے۔ کھڑے ہو کر اک دم غٹاغٹ پانی پینے سے

اکثر دردِ شکم کی تکلیف ہو جاتی ہے۔ اس اندھیرے میں رکھ کر منع کر دینے سے تو اچھا تھا کہ کچھ نقصانات بھی بتا دیے جاتے۔

(۸)

مسلمان متوسط طبقے میں اب تقریباً ہر گھر کے ایک دو لڑکے اعلا تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ سرسیّد کی تحریک نے نوجوان دماغوں پر تو پورا اثر ڈالا تھا، مگر اب بزرگ بھی اس کی افادیت و ضرورت کے قائل ہو چکے تھے۔

لڑکیوں کی تعلیم کا بھی زور شور سے چرچا تھا اور میری ماں اپنے جہیز میں ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، سرسیّد اور شاد عظیم آبادی کا "نحل خانہ" بھی لائی تھیں۔ ان کے ڈپٹی کلکٹر ماموں نے بھانجی کو یہ تحفہ شادی پر دیا تھا۔ انھیں ہفتہ وار "تہذیب نسواں" اور ماہانہ رسالہ "ظلّ السلطان" کا بھی انتظار رہتا تھا۔ محمدی بیگم کا اخبار تہذیب نسواں لاہور سے نکلتا تھا اور موخر الذکر رسالہ بیگم صاحبہ بھوپال کی سرپرستی میں بھوپال سے شائع ہوتا تھا۔ اس دور کی مضمون نگار خواتین میں سے چند کے نام یاد رہ گئے۔ آبرو بیگم، نذر سجاد حیدر، فاطمہ بیگم، والدہ مشتاق حسین، بیگم ہمایوں مرزا وغیرہ وغیرہ

انھیں دنوں جسٹس کرامت حسین نے لکھنؤ میں مسلم گرلز اسکول کھولا اور چودھری محمد علی صاحب ردولوی کی چاروں لڑکیاں وہاں تعلیم کے لیے

بھیج دی گئیں لیکن مجھ پر کیا گزری یہ کسی نے نہ پوچھا۔

اللہ کتنا تڑپ تڑپ کر رہی ہوں اور تصوّر میں کیسے کیسے نقشے اسکول کے کھینچے ہیں، بس نہ پوچھیے۔ میں جو گجن[1] باجی اور چھبّن[2] باجی سے اپنے کو کہیں زیادہ ذہین و قابل سمجھتی تھی، گھر والوں کی قدامت پرستی کی بدولت صرف تصور میں اسکول و کالج کے خواب دیکھتی رہی اور حسرت کے ساتھ ان قصّوں کو سنتی رہی کہ کس طرح گھنٹی بجتے ہی لڑکیاں کلاس روم میں پہنچ جاتی ہیں، کیسی کیسی چہلیں کرتی ہوئی کھانے کی میز پر اکٹھی ہوتی ہیں، اور کتنا مزہ آتا ہو گا جب شام کو فٹ بال یا بیڈمنٹن کھیلتی ہوں گی، مگر یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ والدہ اس کے زیادہ خلاف نہ تھیں، مگر نہ جانے والد کو کیا ہو گیا تھا۔ اتنے روشن دماغ ہوتے بھی وہ راضی نہ ہوتے۔ بزرگ شمشیر بکف تھے۔ کوئی بات نہیں۔ والد کی بات سے دکھ ہوا۔ ان کا خیال تھا، مجھے گھر پر اتنی مکمل تعلیم دلائیں گے کہ اسکول کالج کی ضرورت نہ رہے گی۔ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"۔ اپنی ماں کے پاس اتنی بہت سی کتابیں دیکھ کر میں سوچتی تھی کہ نانا جان یقیناً بہت ذی علم و روشن خیال آدمی ہوں گے۔ انھوں نے اپنی بیٹی کو اتنا خوبصورت خط لکھنا اور اتنی اچھی کتابیں پڑھنا سکھایا اگرچہ مجھے وہ صرف اتنا یاد تھے کہ اونچے قد، ترکی ٹوپی اور شیروانی پہنے ہوئے کھچڑی داڑھی والے ایک شاندار بزرگ مجھے اپنی جیب سے چونی نکال کر دے رہے ہیں، بس۔

امّی جان کی داستان گوئی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنی دونوں لڑکیوں کو رسم و رواج کے خلاف بھاری جوڑہ اور برتنوں

---

[1] محمد علی چچا کی چاروں لڑکیوں میں صرف چھوٹی بہن ہما نے وہاں سے میٹرک پاس کیا۔ باقی سب دو تین سال بعد وہاں سے نکل آئیں اور شادیاں ہو گئیں۔

کے بدلے بینک کے پاس بک دی تھی جس سے بعد کو زمینیں خرید لی گئیں۔ اپنی زمینداری کا انھوں نے بہترین انتظام کیا، شاندار نیا مکان بنایا۔ نئی مسجد بنوائی اور میاں بیوی مع خدمت گار کے حج بھی کر آئے۔ اُن دنوں حج کو جاتے ہوئے لوگ خطا قصور معاف کرا کر، قرض ادا کر کے اور جوان بیٹی کا نکاح کر کے جاتے تھے کہ پتا نہیں اب واپس آئیں یا نہ آئیں، پورا سال اس سفر میں لگ جاتا تھا۔ مکّہ سے مدینہ منوّرہ تک کا سفر جو اب چند گھنٹوں میں ہوتا ہے، تب اونٹ کے دونوں طرف لٹکے ہوئے کھٹولوں میں جنھیں محمل یا شغدف کہتے تھے، پندرہ دنوں میں پورا ہوتا تھا۔ لٹیرے راستے میں قافلہ پر حملہ کر دیتے تھے اور انگریز سرکار کے وفادار تھے۔ ہندستانی، مصری، ترکی یا ایرانی قافلوں کی ہمراہی اور پناہ ڈھونڈتے تھے کیونکہ وہ مسلح ہوتے تھے۔

ایک دن ایک رشتہ دار ملنے آئے اور مجھے مع کتاب ان کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ انھوں نے کورس پوچھا تو معلوم ہوا روایتی نصاب سے پورا انحراف کیا گیا ہے۔ اردو کا قاعدہ پڑھ کر کلام پاک شروع کر دیا اور بغدادی قاعدہ کو نظر انداز کر دیا۔ کریما، مامقیماں بغیر سمجھے پڑھنے کے بجائے انجمن حمایت اسلام کی اردو فارسی کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں۔ اس کے علاوہ لکھنے کی بھی مشق جاری ہے۔ حساب اور انگریزی کی تعلیم بھی ہو رہی ہے۔ یہ سب سن کر وہ برہم ہوئے "بھلا کیا لڑکی کو نوکری کرانے کا ارادہ ہے جو اتنا پڑھوا رہی ہو۔ بس بہت ہو چکا اب پڑھائی ختم کرو۔ یہ ذہنیت تھی اس وقت کے شرفا کی۔

(٩)

وہ ایک عجیب سا گھر تھا۔ اس زمانے کے گھروں سے بہت مختلف۔ اس میں ہمیشہ مہمانوں کی کثرت رہتی تھی۔ مکان کے تین حصے تھے۔ ایک زنان خانہ تھا جہاں ہم سب بھائی بہن اور کئی نوکرانیاں، کھلائی، دودھ پلائی سمیت رہا کرتی تھیں۔ دوسرا مردانہ اور تیسرا شاید مہمان خانہ تھا۔ کبھی یکّہ میں بھرے ہوئے مرد دیہات اور قصبات سے چلے آ رہے ہیں۔ کبھی ڈولیوں اور پالکیوں سے رشتہ دار بیویاں اُتر رہی ہیں۔ کبھی کسی بیمار کو فینس پر بٹھا کر لایا جاتا اور کبھی بیل گاڑی سے مقدمہ باز گنواروں کا قافلہ اُترتا۔ منشی، مولوی، ماسٹر، خدمت گار، سائیس اور آپس میں ہر وقت لڑتی رہنے والی مامائیں یہ سب گھر میں رہتے تھے۔ ان کے علاوہ نوعمر لڑکے جو مقامی اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ ان میں کوئی رشتہ دار تھا، کچھ دوستوں کے نور نظر، کوئی رشتہ کے چچا تھے۔ چند سگے چچیرے بھائی یہ سب اکھٹے کھانا کھاتے۔ ایک ساتھ پڑھنے جاتے۔ شام کو جمع ہو کر یہاں یا اسکول کی فیلڈ میں ہاکی فٹ بال کھیلنے چلے جاتے اور رات میں سب کے سب لالٹین کی روشنی میں ہوم ورک کرتے تھے۔ ان میں دو ہندو لڑکے پٹواری جی کے بھی تھے جو اپنی رسوئی الگ بناتے تھے اور ایک دن مجھے ان کی رسوئی کی فکر ہو گئی۔۔ بچارے لالہ کامتا پرشاد ان دنوں شاید ساتویں کلاس میں پڑھ رہے تھے اور اپنے ہاتھوں کچی پکّی روٹی بنا کر نوالہ منہ میں رکھ رہے تھے کہ میں نازل ہو گئی۔ میں نے ایک پیر رسوئی کی منڈیر پر رکھ کر پوچھا، لالہ کیا کھا رہے ہو؟

وہ لاکھ ہاں ہاں کرتے رہے، مگر یہاں کون سنتا۔ جھلّا کر لالہ نے روٹی کا ایک ٹکڑا میری طرف پھینک دیا۔ بولے، لو اب بھاگ جاؤ۔ غیرت و غصہ سے میں بھنا گئی۔ کیا میں کتا ہوں۔ میں تو یوں نہیں آگئی تھی۔ آگے بڑھ کر میں نے وہ روٹی کا ٹکڑا اُٹھا کر پھر رسوئی میں پھینک دیا۔ لیجیے صاحب رسوئی تو بھنگ ہو گئی۔ لالہ نے برتن دور پھینکے اور روتے ہوئے میرے والد کے پاس پہنچ گئے اور اس دن پہلی بار اتنے زور سے میرے کان اینٹھے گئے کہ بہت دن یہ تکلیف یاد رہی، لیکن تو بھی اپنا قصور سمجھ میں نہ آیا۔ ذرا سا پوچھ لینے پر میری اتنی توہین ہوئی۔ سراسر غلطی لالہ کی تھی، بدتمیزی انھوں نے کی۔ چھوت چھات والا مسئلہ بعد کو سمجھ سکی۔

ان بہت سے لڑکوں میں چار بیٹے میرے تایا (ابّا جان) کے تھے۔ اور ان میں بڑے رفیع بھائی سارے خاندان کے چہیتے تھے۔ بہت ہی سنجیدہ گمبھیر، متبسم، خاموش اور فہم و فراست کی بدولت سب اِن کی عزّت کرتے تھے۔ ان کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا اور ابّا جان کہیں تحصیل دار تھے جو ہم سب کے مشترکہ باپ تھے۔ اپنے والد سے ہمارے بالکل تعلقات نہ تھے۔ ہمیں پیار ملتا تھا صرف انھیں سے اور انتظار صرف ابّا جان ہی کا رہتا تھا اور ابّا جان کے بیٹے اپنے چچا یعنی میرے والد سے مانوس تھے۔ وہی ان کے گارجین تھے۔ اس گھر میں اکیلی لڑکی ہونے کی وجہ سے ہر قسم کی رعایتوں اور تحفوں کی مستحق میں تھی۔ تقریباً چھ سال بعد ایک دوسری بہن آئی۔

رفیع بھائی شرمیلے، خاموش اور ذہین ہوتے ہوئے بھی چچا، چچی اور باپ بلکہ سب بزرگوں کے اتنے فرماں بردار تھے کہ اب سوچ کر حیرت ہوتی ہے۔ لیکن حافظہ میں ایک ایسا سین بھی محفوظ ہے جس سے فرماں برداری کے ساتھ کردار کی مضبوطی و خوداعتمادی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

بالکل خواب کی سی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں۔ مردانہ صحن میں روزانہ بہشتی مشک سے خوب چھڑکاؤ کرتا تھا۔ پھر دو آرام کرسیاں اور بہت سی چھوٹی کرسیاں بچھائی جاتی تھیں اور میرے والد کچہری سے واپسی کے بعد کچھ دیر اندر بیٹھ کر ناشتہ سے فارغ ہو کر سفید براق کرتا پائجامہ پہنے ہوئے باہر آجاتے تھے۔ جلد ہی احباب کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ان دنوں ابّا جان بھی چھٹی پر آئے ہوئے تھے۔ دونوں بھائی بہت بہت لانبے ہتھوں والی آرام کرسی پر دراز تھے۔ لوگ اِرد گرد کرسیوں پر متمکن تھے، ایسے موقع پر چند مصاحبین بھی طنز و مذاق کا نشانہ بننے کے لیے موجود ہوتے تھے۔ سنتی ہوں اس دن والد کے عزیز ترین اور ہم مذاق دوست عبدالوالی صاحب نے (جنھیں بارہ بنکی والے سکتر صاحب[1] کہا کرتے تھے) پوچھا کہ انٹرنس میں رفیع کے کیا مضمون ہیں۔ فوراً مع کتابوں کے ان کی طلبی ہوئی۔ والی صاحب نے کتاب ہاتھ میں لے کر کچھ سوالات شروع کیے۔ ایک دو کا جواب تو رفیع بھائی نے دیا اور پھر نہ جانے کیوں خاموش ہو گئے منہ پھلا کر بیٹھ گئے۔ اب باپ ڈانٹ رہے ہیں۔ چچا خفا ہو رہے ہیں۔ والی صاحب اصرار کر رہے ہیں، اور " وان ایک خاننشی مرے سب کے جواب میں۔"

پندرہ سولہ سال کی عمر گول مٹول جسم آنکھیں جھکائے بیٹھے ہیں نہ جانے کیوں یہ ڈانٹ ڈپٹ مجھے بہت بری لگی۔ بھاگ کر ماں کو خبر سنائی اور وہ پردے سے لگ کر باہر کا منظر دیکھنے لگیں۔ والی صاحب اور دوسرے لوگ اٹھ کر چلے گئے، تو پہلے چچا نے ان پر کتاب پھینکی پھر ابّا جان کے بوتے اور دھم دھم کی آوازیں آئیں اور میری ماں نے اپنے

---

[1] یہ غالباً سکریٹری کا مخفف تھا۔ کیونکہ والی صاحب میونسپل بورڈ کے سکریٹری تھے۔

آنسو پونچھنے شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر بعد میں باہر نکلی تو دو کر سیوں پر رفیع بھائی اوندھے پڑے تھے، محفل درہم برہم تھی۔ میں نے کہا ابّا جان یہ بستر یہاں کیوں رکھا ہے اور انھوں نے انتہائی غصے سے جواب دیا۔ یہ تمھارا نالائق بھائی ہے، بستر نہیں ہے۔ دوسرے دن صبح جب ان سے ملی تو آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ چچا کے پاس طلبی ہوئی۔ زنانہ مکان میں ایک ستون سے لپٹے وہ کھڑے تھے۔ چچی رو رہی تھیں اور چچا ان کے سر پر ہاتھ رکھے کچھ سمجھا رہے تھے، میں نے بھی رونا شروع کر دیا۔ برسوں بعد پتا چلا کہ ان کے جواب صحیح تھے، والی صاحب سمجھ نہ سکے، اس لیے انھوں نے خاموشی بہتر سمجھی۔ انھیں یقین تھا میں اپنی جگہ درست ہوں، اس لیے سب کچھ سہہ لیا۔ اپنی بات سے نہ ہٹے، اور ان سب کی بزرگی کا بھرم بھی قائم رکھ لیا۔ کوئی بدتمیزی نہیں کی۔

اس سے پہلے کہ ہم لوگ ایک اور بڑی کوٹھی میں منتقل ہوں رفیع بھائی کے لیے ایک اور ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا۔

رشتہ دار طلبہ میں کچھ شعر و شاعری اور تاش و شطرنج کے شوقین بھی تھے۔ ہاکی فٹ بال ٹینس پر یہاں کوئی پابندی نہ تھی، مگر تاش شطرنج اور پتنگ بازی وغیرہ سے ابّا جان و عمّو جان (میرے والد) دونوں کو نفرت تھی۔ ان کا خیال تھا، مسلمانوں کے ادبار اور شاہی حکومت کے زوال میں ان فضولیات کا بھی حصہ تھا۔ اگر لڑکا ان کھیلوں میں پڑ گیا تو حصولِ علم سے طبیعت ہٹ جائے گی اور رفیع بھائی کو ہاکی سے کم شطرنج سے زیادہ دلچسپی تھی۔ یہ خبر کسی نے باپ چچا تک پہنچا دی۔ پھر تو سختی کے ساتھ تنبیہ کی گئی کہ ان لڑکوں سے اپنے کو بالکل الگ کرلیں، بول چال ترک کرنا یا ترکِ تعلق ان کی فطرت کے خلاف تھا، لیکن بدرجۂ مجبوری اس حکم کی انھیں تعمیل کرنی پڑی۔

کتنا فرق تھا ان دونوں بھائیوں میں۔ رفیع بھائی خاموش و متحمل مزاج، شفیع صاحب باتونی اور تیز مزاج۔ یہ موٹے وہ دبلے۔ یہ بلا کے ذہین اور غضب کا حافظہ رکھنے والے، وہ بہت محنتی و جفاکش۔ اس بحثا بحثی میں رفیع بھائی تو اس حکم کو ناجائز سمجھتے ہوئے بھی شربت کے گھونٹ کی طرح پی گئے اور شفیع صاحب کی ان سب سے جنگ ہو گئی۔ دوستوں میں خوب زور دار کشتی ہوئی اور میں نے دور سے تماشا دیکھ کر سارے گھر کو خبر سنائی۔ یوں اس گروہ میں دو پارٹیاں بن گئیں اور چند نے بول چال بھی بند کردی۔ اتنی خیریت ہوئی کہ جلد ہی رفیع بھائی اور شفیع صاحب دونوں علی گڑھ سدھار گئے۔ نہ جانے کتنے امام ضامن، ڈھیروں ناشتہ اور ایک ملازم ساتھ لے کر دونوں اعلا تعلیم کے لیے روانہ ہو گئے۔

۱۰

ایک نئے بہت بڑے ماڈرن قسم کے گھر میں آنے پر ہمیں بہت خوشی ہوئی، حالانکہ اب اس گھر میں رفیع بھائی کے سب سے چھوٹے بھائی کو چھوڑ کر باقی سب شرارت مار کٹائی اور لڑائی میں ماہر باقی رہ گئے تھے۔ وہ بچارے بڑے سلیم الطبع اور منجاں مرنج تھے۔ صرف دس ماہ کے تھے جب ماں کی محبت سے محروم ہو کر نانی کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ لیکن بیچ والے (محفوظ احمد) جنھیں میں فتے بھائی کہا کرتی تھی باوجود پیار محبت کے اس زور سے ڈانٹتے تھے کہ ان کی کسی چیز کو ہاتھ لگانا

ناممکن تھا، اکثر ساری شرارتوں کے بانی مبانی وہی ہوا کرتے تھے، اور میرے چھوٹے سے بھائی انھیں سے ٹریننگ لے رہے تھے اور تب میں نے نوکروں سے دوستی بڑھائی۔ نوکر بھی عجیب عجیب کینڈے کے تھے۔ بچارا خانساماں۔ اس کی تو شکل بھی بس اس وقت دیکھنے کو ملتی جب وہ ڈیوڑھی میں پچھلا حساب دینے اور نیا آرڈر لینے آتا۔ پردے کے پیچھے سے میری ماں اس کا حساب کتاب کرتیں اور کسی نوکرانی کے ہاتھوں آج کے سودا سلف کے لیے روپے اس کے ہاتھوں میں پہنچا دیے جاتے تھے۔

رمضان بابا دربان تھے، جو بڑا سا لٹھ سامنے رکھے پھاٹک میں بیٹھے قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔ کیونکہ حافظِ قرآن تھے۔ اتنا تیز پڑھتے تھے کہ سمجھنا مشکل تھا اور ان سے بات کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل۔ ایسے اجڈ کہ پھاٹک کی طرف رخ کیا اور وہ پکارتے، کہاں جارہی ہو، بلٹو ادھر۔ آواز سنتے ہی جیسے جان سوکھ جاتی۔ ان میں ایک پہلوان بھی تھے جو دادا جان مرحوم کے خاص پہلوان ہونے کی وجہ سے بہت ذی عزت تھے، سوا میرے باپ چچا کے اور سب اپنے دستر خوان پر انھیں ساتھ بٹھاتے تھے۔ بچوں کے تو جیسے وہ اتالیق تھے اور گانو کی زمینداری اور گھر کے منتظم و نگران بھی تھے۔ تین حج کرنے کے بعد ان کی فہم و تقدیس کا سب نے لوہا مان لیا تھا۔ کبھی کبھار ان کے ایک پہلوان دوست بھی آکر کئی کئی ماہ قیام کرتے تھے۔ انھوں نے بھی دادا جان کے سامنے بہت کشتیاں ماری تھیں اور انھیں بیسیوں داستانیں، کہانیاں بھی یاد تھیں۔ بس مشکل یہ تھی کہ پاس بیٹھ کر کہانی سننا بڑا صبر آزما ہوتا تھا۔ تیل اور پسینے کی بدبو کے ایسے بھبکے اٹھتے تھے کہ دماغ چکرا جاتا تھا۔ فجے بھائی کہتے تھے بھوانی بکرے[1]

[1] یہ بکرا بھوانی کے نام پر خصی کر کے چھوڑ دیا جاتا تھا اور لوگ کہتے تھے اس میں بڑی بو ہوتی ہے۔

کی سی بو ہے۔ پھر بھی قصہ گل بکاولی، داستانِ حاتم طائی، انار بادشاہ زادی کی کہانی اور ابیرج نامہ' ان سے دور دور بیٹھ کر میں نے سنا۔ ہر کہانی دو چار دن میں ختم ہوتی۔

کہانیوں میں تو خوب لطف آتا، مگر جب خاں صاحب ڈینگیں مارتے کہ میرے باپ سے ایک پہلوان کا مقابلہ ہوا اور خدا بخشے والد ماجد نے اس کا سر پکڑ کر ہاتھوں سے یوں دو ٹکڑے کیا جیسے امرود توڑا جاتا ہے یا کسی وقت ان پر مذہبیت کا دورہ پڑتا اور بیان کرتے کہ ایک عورت پر قبر میں اس لیے عذاب ہوا کہ اس کے شوہر نے پانی مانگا اور وہ نماز پڑھنے چلی گئی تھی، خدا تعالی نے فرمایا' تجھے اپنے خدائے مجازی کا حکم پہلے ماننا چاہیے تھا۔[1] جا اب دوزخ میں جل' یہ سب سن کر نہ جانے کیوں میرا دل چاہتا، اس بڈھے کی بڑی سی توند کھسوٹ ڈالوں۔ خود تو تیس بتیس چپاتیاں کھا کھا کر اتنے زور سے ڈکار لیتا ہے اور پھر اپنے حق کی بات کرتا ہے۔ عورت کا بھی تو کچھ حق ہوگا۔ میری ماں کے پاس میرے تیکھے سوالات کا کوئی شافی جواب نہ ہوتا۔ وہ کہتیں' یہ سب جہالت کی باتیں ہیں۔ پڑھ لکھ کر تم خود سب کچھ جان لوگی۔ ویسے خود ان کو مکمل مساوات حاصل تھی اس لیے ان کو کوئی فکر بھی نہ تھی۔ تصدیق یا تردید کی۔

[1] حالانکہ خاں صاحب ابھی تک کسی عورت کے خدائے مجازی نہ تھے

۱۱

ہر سنیچر کو گانو (مسولی) سے دادا جان کے ایک بھائی آیا کرتے تھے۔ میرے والد کے اس وقت دو حقیقی چچا حیات تھے۔ یہ منجھلے بھائی تھے اور ان کے اکلوتے بیٹے یہیں تعلیم پا رہے تھے۔

دادا ویسے بھی لانبے چوڑے بڑی بڑی آنکھوں والے تھے۔ اس پر لباس ایسا پہنتے تھے کہ باید و شاید۔ ان کے ڈھیلے ڈھالے کرتے میں اوپر تلے دو دو جیبیں ہوا کرتی تھیں اور دو جیب دونوں پہلو پر نیچے لٹکتی رہتی تھیں۔ ایک میں ریزگاری سے بھرا ہوا بٹوا ہوتا، دوسرے میں تسبیح و رومال وغیرہ۔ تیسری میں شاید حقہ کی تمباکو وغیرہ غرض ہر جیب میں کچھ نہ کچھ رکھتے تھے۔

وہ آتے ہی باہر سے اندر تک چھوٹے بڑے سب کو دو دو پیسے تقسیم کرتے تھے۔ ہم سب کو یہ خوشی ہوتی تھی کہ یہ دو پیسے اس جیب خرچ کے علاوہ ہوتے تھے جو ہر روز ہمیں ملتا تھا۔ سستا زمانہ تھا۔ ان دو پیسوں میں چار بتاشے اور چار نمکین بسکٹ مل سکتے تھے۔ ان دو پیسوں سے ایک کوزہ کھیر کا بھی مل جاتا تھا، ایک قفلی ملائی کی اور دو عدد گولا کے کباب کھائے جاتے تھے اور یہ ساری خریداری ان سودے والوں سے ہوتی تھی جو مستقل پھاٹک کے باہر آوازیں لگایا کرتے تھے۔ اندر تو رمضان بابا کا ڈنڈا ان کو گھسنے نہ دیتا تھا۔ بڑے

پھاٹک کے صحن میں سائیس کوارٹر کے سامنے تک جانے کی ہمیں اجازت مل جاتی تھی۔ سنیچر کے دن یہ خریداری دگنی ہو جاتی۔ آخر میں ہاضم چورن اور کھٹ مٹھی گولیاں بھی کھائی جاتیں۔

دادا پیسے بانٹ کر کاغذات سمیٹ کر کچہری جاتے۔ دوپہر کا کھانا وہ نبی بخش باورچی کے اسٹیشن والے ہوٹل میں کھاتے، جو صبح سے نفیس کھانے تیار کیے ہوئے ان کا منتظر ہوتا تھا۔ سہ پہر بھتیجے، یعنی میرے والد سے مل کر وہ گانو واپس چلے جاتے۔ دوران ملاقات مستقل ٹہلتے رہتے اور دو چار جملوں کے بعد وظیفہ انگلیوں پر پڑھنے لگتے۔ حاجی بھی تھے اور حافظ قرآن بھی۔ حضرت امام حسین کے عاشق تھے۔ محرم میں تعزیہ داری، سبیل، مجلسیں سب کچھ کرتے تھے۔ بس ماتم نہیں ہوتا تھا۔

ان بہت سے آنے والوں میں میری ماں کے حقیقی تایا بھی تھے جو ہمیشہ کسی مقدمہ سے نمٹنے کے لیے کبھی کبھی آتے تھے۔ ان کا لباس جوگیا رنگ کے کرتے اور لانگ دار دھوتی تھا۔ سردیوں میں ایک شال اور روئی دار بنڈی کا اضافہ کر لیتے تھے۔ ان کے یہاں کا چہلم بہت زور دار ہوتا تھا اور اس فقیرانہ لباس میں مزارات پر بھی گشت کرتے رہتے تھے۔

ہر رئیس کے پاس ان دنوں اپنی گھوڑا گاڑی فٹن، ٹمٹم ضرور ہوتی۔ میرے چچا اور خالو نواب علی صاحب کے پاس بھی ایک بہت منہ زور گھوڑا تھا جو انھیں تانگے پر کچہری لے جایا کرتا تھا۔ ایک دن نانا بارہ بنکی آئے تو کچہری کے اندر داخل ہوتے ہی اس ظالم سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ خالو جان کو کچہری پہنچا کر گھر واپس جا رہا تھا۔ کوچبان نے لاکھ روکا، لگام کھینچی، مگر وہ نانا کو زمین پر گراتا ہوا گھر روانہ ہو گیا۔ جان تو بچ گئی مگر چوٹیں بہت آئیں۔ بالکل لاش کی

طرح اُٹھا کر بڑے نانا ہمارے گھر لائے گئے۔ ڈاکٹر آئے۔ مرہم پٹی ہوئی۔ ماں تیمار داری میں لگ گئیں اور ان کے گاؤں خبر بھجوائی گئی۔

اب یہ یاد نہیں ہے۔ اسی روز یا دوسرے دن کئی رتھ آکر دروازے پر رُکے۔ اس میں بہت سے آنے والوں میں سے تین لحیم شحیم بیویاں آہیں بھرتی سینہ پیٹتی اور گھوڑے کو کوستی ہوئی نیچے اُتریں۔

اور اس دن پہلی بار مجھے معلوم ہوا، ایک نانا کے گھر اتنی ڈھیر ساری نانیاں بھی ہو سکتی ہیں اور چوتھی اگر اللہ کو پیاری نہ ہو گئی ہوتیں تو تخت کا چوتھا کونہ بھی آباد ہوتا۔ البتہ ان کی نمایندگی دو لڑکیاں کر رہی تھیں ان سب کے انداز، حلیہ اور مراتب میں اتنا فرق تھا کہ یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ان میں اصلی اور سب سے بڑی کون ہیں۔ گوری بھبھوکا جلیبی گول مٹول یہ نانی ولی عہد بہادر کی ماں بھی تھیں۔

ہر سال اس زمانے کے ماڈرن گھر میں یہ تشریف آوری کوئی معمولی بات نہ تھی۔ میں بلا وجہ سب کے مذاق کا نشانہ بن گئی۔ لوگ ہنس ہنس کر پوچھتے تھے۔ "بی بی آپ کی کتنی نانیاں آئی ہیں"۔ اور میں مارے غصّہ و شرم کے ان کے بکوٹے[1] بھر لیتی تھی۔

اس گھر کے مستقل اور خوش آیند مہمان چودھری محمد علی رُدولوی تھے۔ ان سے میرے والد کی گہری دوستی تھی۔ میرا بھائی وجو ان کا چہیتا بیٹا تھا۔ ان کے ساتھ آنے والی لڈو کی، خرسوں کی ہانڈیاں بھلا ہم کیسے بھولتے۔ سگے چچا نہ ہوتے ہوئے بھی وہ ہمیں سگے لگتے تھے اور بے تابی سے ان کا انتظار رہا کرتا تھا۔

لیکن جو یہاں آتا وہ اپنے ساتھ مقدمات کی فائلیں ضرور لاتا

[1] چٹکی انگلیوں سے لی جاتی ہے اور بکوٹے کے لیے پورا پنجہ استعمال ہونا پڑتا ہے۔

تھا اور بلا فیس لیے میرے والد ان کی پیروی کرتے تھے۔ ان میں معمولی کسانوں سے لے کر تعلقہ داران اودھ تک شامل تھے۔ زمینداریاں سود در سود کی بدولت اور پرانی شاہ خرچیوں کو جاری رکھنے کی وجہ سے لب دم تھیں، اللہ ہی جانے میرے عمّو جان پیسا کن لوگوں سے کماتے تھے، سب تو ان کے اپنے تھے۔

۱۲

آخر کار میرا باہر پھرنا، نوکروں میں بیٹھنا، بزرگوں کو قابلِ اعتراض نظر آنے لگا۔ اب مولوی صاحب اور ماسٹر صاحب کے علاوہ غیروں سے ملنے کی ممانعت ہو گئی۔ گھر کے اندر صرف مامائیں تھیں اور ان کے بد تمیز بچے۔ کوئی صرف چھت کے پنکھے کی ڈوری ہلاتی رہتی تھی، کوئی اندر باہر پیام رسانی۔ ان میں ایک میری بوا تھی۔ ایک میرے بھائی کی دودھ پلائی، صفائی ستھرائی اور سلائی کرنے والیاں اکثر آپس میں لڑتی رہتیں۔ ان میں خدا بخشے میری بوا پیش پیش ہوتیں۔ ان کی دہاڑ سنتے ہی ماں کو غصّہ آجاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ روتی ہوئی گھر سے نکل جاتیں۔ پیچھے پیچھے ہم سب بھائی بہن ان کو روکتے ہوئے باہر دوڑتے۔ گیٹ پر کوئی نہ کوئی یکّہ انھیں نظر آجاتا اور بوا اس یکّہ کو روک کر اس پر سوار ہو جاتیں۔ اس وقت چھوٹی بہن ان کی گود میں ہوتی تھی۔ ساتھ ہی ہم سب بھی یکہ پر چڑھ جاتے، اور بوا بھی غضب کی تھیں کہ اس پورے قافلے کو

لے کر شہر سے چند میل دور اپنے سوتیلے بیٹے کے گھر ہم سب کو لے کر پہنچ جاتیں، گھر میں ہل چل مچتی۔ حاجی چھوٹک یا ایک اور فدوی قسم کے رشتہ دار شام تک جاکر بوا کو منا منو کر اس قافلے کو خوش خوش واپس لے آتے تھے۔

یہ گوری سی لہنگا پہنے ہوئے سفید دوپٹا اوڑھے ہوئے برہمنی اپنی برہمن برادری سے اس لیے خارج کردی گئی تھی کہ اس نے بال ودھوا ہوتے ہوئے ایک مسلمان پٹھان سے شادی کر لی تھی، حالانکہ اسے ہندو رسم و رواج کے مطابق ہمیشہ ودھوا ہی رہنا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ کسی سادھو کے ساتھ آشرم میں چلی جاتی۔ مگر اس نے شادی رچائی، وہ بھی ایک بیوی بچوں والے مسلمان سے۔

بدقسمتی یہاں بھی ساتھ آئی۔ جوانی پوری گزری بھی نہ تھی کہ وہ دوبارہ بیوہ ہو گئی اور تب سے وہ ہم سب بھائی بہنوں کی کھلائی، گھر کی مالک مختار اور سب نوکروں کی سردار بن گئی۔ لیکن سوتیلے بیٹے اور پوتی پوتوں سے محبت و سلوک کی حد نہ تھی۔ کمائی ان کی نذر کر دیتی تھی۔ جو اچھا کپڑا ملتا شہادت خان کی بچیوں کی پہنا آتی۔ روٹھتی تو وہی گھر اسے یاد آتا۔ ویسے وہ سب بھی اس کی عزت بہت کرتے تھے۔

بوا کو ہندو دیو مالا کی داستانیں بکثرت یاد تھیں۔ رامائن اور مہابھارت کی چوپائیاں۔ ستی ساوتری کی کہانی۔ شکنتلا دشینت کا افسانہ اور فصلی ہندی مہینے۔ نکھتر۔ موسمی محاورے، ہم سب اس سے رات کو بستر پر لیٹ کر سنتے تھے۔

کبھی اس نے گائے کا گوشت نہیں کھایا، دیوالی، ساون، دسہرا اور محرم، میلاد مجلسیں، اس کے انتہائی شوق و دلچسپی کی چیزیں تھیں۔ مسلم تہواروں میں شاید روزہ اور عید اسے زیادہ پسند تھی۔ پورے روزے

رکھتی۔ اپنی ادھوری نماز کے بول دہراتی تھی

ویسے بھی ان دنوں موسمی تہوار مل جل کر منائے جاتے تھے۔ بسنت کے روز ہر گھر میں میراثنیں ڈومنیاں ڈھول لے کر پہنچ جاتیں اور صرف کھیتوں میں نہیں گھروں میں سرسوں کے بسنتی پھول اور آم کے بور کی مہک پھیل جاتی تھی۔ بسنتی جوڑے پہنے ہوئے لڑکیاں بہوویں اتراتی پھرتی تھیں۔

ساون میں زمین پر قوس قزح (دھنک) کے رنگ لہراتے۔ مجھے ننھیال ددھیال ہر جگہ سے چنری ملتی۔ گھر میں الگ ماں رنگوا دیتیں۔ جھولے کا انتظام ہوتا اور محلے ٹولے کی لڑکیاں آکر ملہار گاتی تھیں۔ ہندو گھرانوں میں پوجا ہوتی تھی مگر مسلمانوں نے اس موسمی تہوار کی خوبصورت چیزیں رنگ، جھولے، پکوان، مہندی، چوڑیاں اور لوک گیت لے کر اسے اپنا لیا تھا۔

دیوالی کی راتوں میں گھروندا چھوٹے چھوٹے دیوں کی روشنی سے جگمگا اٹھتا تھا۔ ہر خاندان میں کوئی نہ کوئی لڑکا پینٹنگ کا خود ساختہ اکسپرٹ ہوتا تھا، جو ہمارے گھروندوں کو گل کاریوں سے سجا کر راجا کا چھوٹا سا محل بنا دیتا تھا۔ یہاں کوئی دیوی دیوتا کی مورت نہیں ہوتی تھی۔ بس کھلونے، رنگین مٹی کے برتن، چوڑے، کھیلیں اور بتاشے رکھے جاتے تھے۔ شگون پورے جاتے اور عام تقسیم ہوتی۔ البتہ جمگھٹ کی رات ہمیں صحن میں نہ نکلنے دیا جاتا کہ کہیں جادو کی ہانڈی ہمارے سر نہ گر پڑے اور بڑی دیوالی کی رات چوڑے بھی نہیں کھانے دیے جاتے تھے۔ اس لیے کہ خدا کے گھر قیامت میں لوہے کے چوڑے چبانے پڑیں گے۔

ہولی کا تہوار عام طور سے مسلمانوں میں نہیں منایا جاتا۔ البتہ

اس دن مسلم مسور اور گوشت کا قلیہ پکا کر حضرت ابراہیمؑ کی نیاز دلوائی جاتی تھی۔ بزرگوں کا خیال تھا، یہ آگ وہی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے لیے نمرود نے جلوائی تھی اور وہ بادشاہ ہندستان یا اس کے قریب کہیں کا تھا، جس نے حضرت ہاجرہ سے ان کی شادی کی تھی۔

لیکن اگر اس سال کوئی نئی بہو گھر میں آئی ہوتی، تو دیور نندیں وغیرہ اکٹھے ہو کر کسی خاص احاطہ یا کوٹھے پر جا کر اس سے زوردار ہولی کھیلتے تھے اور بزرگ سب کچھ جانتے ہوئے بھی جوانی کی اُمنگ اور کھیلنے کھانے کے دن کہہ کر اَن جان بن جاتے تھے۔

ایک بات بتادوں۔ یہ سارے تہوار، رسومات اور اودھم میرے دادھیال میں ہوتے تھے اور ناںہال والے شریعت کے خلاف بدعت کہہ کر مجھے منع کرتے تھے کہ اس میں حصّہ نہ لوں، حالانکہ مزہ انھیں رنگ رلیوں میں آتا تھا۔

دسہرے کی جھونجھیاں[1] لے کر محلّے کے غریب بلا تفریق مذہب آتے اور ایک خاص راگ گا کر پیسے لے جاتے تھے۔ رمضان کی افطاری بلیوں ہریجن اور غریب بچوں میں پہلے تقسیم کر دی جاتی تھی۔ محرم کی سبیل اور تبرک سے بلا قید مذہب و ملت، ہر شخص مستفیض ہو سکتا تھا کیونکہ شیرینی بنانے والے اور شربت پلانے والے دونوں مذاہب کے لوگ ہوتے تھے۔ تعزیے کو اُٹھا کر چلنے والے ہندو کہار نہا دھو کر سُرخ انگوچھا سر پر باندھ کر "یا علی" کے نعرے کے ساتھ تعزیہ اُٹھاتے اور نوحہ مرثیہ کے ساتھ اودھی زبان میں غمزدہ دوہے پڑھتے۔ رونے والیاں ہندو مسلم عورتیں اس کے پیچھے ہو لیتیں۔

---

[1] جھونجھی مٹّی کی بنی ہوئی جالی دار ہانڈی ہوتی تھی۔ اس میں دیا جلتا تھا۔

منّت ماننے والیاں بچّوں کو ہرے کپڑے پہنا کر امام حسین کے فقیر کے طور پر بلا تخصیص ہر گھر میں بھیجتی تھیں اور ہریجن عورتیں دس محرّم کو سارے دن روزے سے رہ کر نذر و نیاز کے لیے حافظ جی کا دامن تھام لیتی تھیں۔

میں نے اس داستان کو شاید زیادہ طویل کر دیا ہے۔ لیکن آج کے ہندستان کی نفرتیں، عداوتیں، کشت و خون دیکھ کر یاد آتا ہے کہ بقول شبلی نعمانی:

یہی تھیں وہ شمیم انگیزیاں عطرِ محبّت کی
کہ جن سے بوستانِ ہند برسوں تک معطّر تھا

اور تب ہم دونوں غلام بن چکے تھے اور آٹھ سو سال تک حکمرانی کرنے کے بعد صاحب اقتدار و قوّت لوگوں نے میل ملاپ کی یہ بنیاد ڈالی تھی لیکن اس صرف بتیس برس کے اقتدار نے رواداری و محبّت کا تختہ لوٹ دیا۔

(۱۳)

بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے علماءِ وقت کے مواعظ نے صحیح اسلامی شریعت کا شعور پیدا کر کے سُنّی اور شیعہ فرقوں کو اپنے عقائد میں اتنا پختہ کر دیا تھا کہ آپس میں شادی بیاہ ممنوع ہو چکا تھا بلکہ اکثر طلاق تک کی نوبت آجاتی تھی۔ برادرانہ تعلقات میں فرق آگیا تھا۔ میرے اعزہ میں

شیخ زادوں کے وہ خاندان بھی تھے جن کا خیال تھا کہ نوابین اودھ جادۂ شریعت سے ہٹ کر بعض اوقات اسلام سے منحرف ہونے کی منزل تک پہنچ گئے تھے۔ ان دنوں اگر ایک بھائی سنّی ہوتا تھا تو دوسرا شیعہ ہو سکتا تھا۔ بکثرت تفضیلیے سنّیوں میں موجود تھے اور عقد نکاح کے لیے اسلام کی شرط تھی۔ شیعہ، سنّی، شافعی، حنبلی کی نہیں۔ لیکن مولانا اسماعیل شہید اور ان کے ساتھیوں کے مواعظ نے صحیح اسلامی شریعت کا شعور پیدا کر دیا تھا۔ میرے سامنے اس دوری کے باوجود بھی رشتہ داری اور دوستیوں کا احترام باقی تھا۔ گذشتہ تمام غیر اسلامی رسوم و بدعات کو خرافات کہہ کر گھروں سے خارج کیا جا رہا تھا۔ اگرچہ شیعہ سنّی شادیاں ممنوع ہو چکی تھیں، مگر اس سے قرابت داری اور دوستی میں فرق نہیں آیا تھا۔

مشکل یہ آن پڑی کہ میرے مرنجان مرنج والدین کے بکثرت شیعہ، ہندو، پارسی اور کرسچین دوست تھے۔ بلکہ ہم لوگ تو اپنے پرانے ملازمین کو بھی صرف نام لے کر نہیں پکار سکتے تھے۔ گھورے دادا، منگل بابا، کہہ کر بلاتے تھے، ورنہ فوراً ڈانٹ پڑ جاتی کہ بڑوں کے نام لے کر نہیں بلایا جاتا۔ اس ماحول کا نتیجہ تھا کہ ہماری نگاہوں میں وسعت اور کشادگی پیدا ہو گئی تھی۔

۱۹۲۰ء تک اودھ کے اکثر دیہات میں خاندانِ رسالت کی فرضی تصاویر، سونے چاندی کے علم، ڈھول تاشے شہنائیاں اور بینڈ، محرّم و چہلم میں دیکھیے۔ خاص کر چہلم تو ایک بہت بڑا میلا ہوتا تھا۔ اس میں نوحہ اور مرثیہ ماتم اور مجلسوں کے ساتھ کشتی، بانک پٹا، لیزم اور بین و نفیری کے کمالات کی نمائش بھی ہوتی تھی۔ سوز خوانی کے علاوہ شیعہ فرقہ میں کرایے کے "رونے" (رونے والے) بھی لکھنؤ سے بلائے جاتے تھے اور بقول اکبر الٰہ آبادی

"پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہو گا"

چہلم میں صاحبِ حیثیت افراد دعوت عام کیا کرتے تھے۔ میرے والدین ان سب سے کوسوں دور تھے۔ اس کے باوجود محرّم کے تین چار دن وہ روزانہ مسولی جاتے تھے تاکہ سب کچھ بخیر و خوبی لوگوں کی مرضی کے مطابق ہو جائے اور سنجھلے دادا اپنا امام باڑہ سجا کر روزانہ ذکر شہیدانِ کربلا اطمینان سے کر سکیں۔ ان دنوں وہ سر سے پیر تک سبز پوش رہتے تھے۔ حالانکہ شیعہ افراد سیاہ پوش ہوتے تھے، لیکن سینہ کوبی، منہ ڈھانپ کر رونا، ماتم کرنا ممنوع تھا۔ البتہ خیر خیرات نذر و نیاز، لنگر اور سبیل کا زور شور سے اہتمام ہوتا تھا۔

اس چھوٹے سے گانو میں مہینے دوسرے مہینے کسی نہ کسی بزرگ کا عرس ہوتا تھا اور اس تاریخ کو معزز خواتین بھی رت جگا کرنے مزاروں پر جاتی تھیں۔ صبح فاتحہ قُل کے بعد گھر واپس آتیں۔ البتہ میلا گھومنا برا سمجھا جاتا تھا۔ میری والدہ نہ کسی عرس میں جاتی تھیں، نہ رت جگے میں۔ اگرچہ مجھ پر زیادہ پابندی نہ تھی اس لیے میں نے دو چار بار سر گشتیوں کا، عورتوں کے ہو حق کا لطف اُٹھا لیا، ماں نے صرف اتنا کہا، دیکھو یہ سب خلاف شرع باتیں ہیں۔ ہمیں صرف خدا سے دعا مانگنی چاہیے۔ پیر بزرگ خود اس کی رحمت کے محتاج ہیں۔ علماءِ فرنگی محل کا خاندان بھی بانسہ شریف میں شاہ عبدالرزاق[1] صاحب کے عرس میں شرکت کے لیے آتا تھا۔

عام عورتیں جب ٹھنک ٹھنک کر میلے جانے کی فرمائش کرتیں اور مرد نہ پوری کرتے، تو ان پر جن بھوت کا سایا ہو جاتا تھا اور تب وہ سب درگاہوں میں لے جائی جاتی تھیں، جہاں ان کی والہانہ جنونی حرکات کو اسی جن یا عفریت کی کرشمہ سازی مان کر صاحب

[1] سید شاہ عبدالرزاق حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے خلیفہ جن کا ہمارا خاندان بہت معتقد تھا اور علماے فرنگی محل بھی ان کو اپنا مرشد کہتے تھے۔

مزار سے چھٹکارے کی دعا کی جاتی تھی۔ اور تب جِنّ بھرے سیلے میں یا خاص قِل کے وقت عفریت "میں جلا میں جلا" پکارتا ہوا رخصت ہو جاتا۔ یہ ایک دلچسپ تماشہ ہوتا تھا۔ مجھے شاید ایک یا دو بار یہ منظر دیکھنا نصیب ہوا۔ ایسی عورتوں کی نیم برہنگی کو بھی یہ کہہ کر گوارا کر لیا جاتا تھا، کہ "بچاری اپنے ہوش میں تھوڑی ہے"۔ بچّوں کے گلے میں تعویذ، نادِ علی، ستھ جوڑی، بڑے پیر کا چھلّا، محرّم کا کلاوہ اور نہ جانے کیا کیا الا بلا حمیل کی طرح جھولا کرتا تھا۔

لیکن ہم سب بھائی بہنوں کی گردنیں اس بوجھ سے خالی تھیں اور اس لیے میں اکڑ کر کہتی تھی۔ میں ان فضولیات کو نہیں مانتی، حالانکہ راتوں کو بھوتوں کی کہانیاں سن کر مارے ڈر کے بچھ میں آنکھ تک کھولنے کی ہمت نہ تھی۔ میری عزیز ترین اور ہم عمر سہیلی فرید النساء بھی ساتھ ہی بول اٹھتی، میں بھی نہیں مانتی ہوں۔ وہ بے ماں کی ہوتے ہوئے سارے خاندان کی چہیتی تھیں۔ باپ تو ان کو فرید بیٹا کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کو میر انیس کے مرثیوں سے عشق تھا۔ چھوٹی سی عمر میں اللہ رسول اور اہلِ بیت پر فدا تھیں اور حسرت سے کہا کرتی تھیں، اگر حضرت علی اکبر مل جاتے تو ان کی مرید ہو جاتی، کیونکہ وہ ہم شکل نبی تھے۔ اور پھر ایک دن انھیں خواب میں زیارت ہو ہی گئی، مگر شکل وہ نہ تھی جو ان کے تصور میں تھی۔ اپنے بھائی سے ملتے جلتے حضرت علی اکبر کو دیکھ کر وہ بے انتہا خوش ہوئیں۔

(۱۴)

ایک سال گرمیوں میں جب میں گانو گئی۔ تو ایک نئی تبدیلی دیکھی۔ مکان کے باہری حصّے میں چھوٹے دادا کی چوپال کو ٹٹیوں سے کور کر کے وہاں ابّا جان (رفیع بھائی کے والد) نے لڑکیوں کا پرائمری اسکول کھلوا دیا تھا لڑکوں کا پرائمری اسکول پُرانا تھا، جس میں ایک مولوی ایک ماسٹر اور ایک لالہ جی پڑھایا کرتے تھے۔ لڑکیوں کی تعلیم کی بنیاد ابّا جان مرحوم کی کوشش سے پڑی۔ بعد کو ورناکیولر مدراس کے انسپکٹر نے اُسے منظوری دے دی اور ایک مولوی صاحب کا تقرر ہو گیا۔

سارے شریف گھرانوں کی لڑکیاں فوراً اس میں داخل ہو گئیں۔ لیکن ہندو گھرانوں کے کان پر جوں نہ رینگی اور جب ایک روز سیاہ سایہ پہنے، سفید ہیٹ لگائے خوب کالی موٹی بھدّی سی ایک میم صاحب تشریف لائیں، تو انھوں نے اعلان کیا اب یہاں اُستانی جی بھی آنے والی ہیں، اس لیے مکان کی تلاش شروع ہوئی۔ آخر کار اسی محلّے کے ایک ٹوٹے مکان کی مرمّت ہو کر مدرسہ وہاں شفٹ ہو گیا۔

لیڈی ٹیچر نے آتے ہی سب پر رعب جما لیا۔ دو ایک لڑکیوں سے گہری دوستی کر لی۔ ساتھ ہی اپنے خاندان والوں کو بھی کرایے کا مکان لے کر یہیں بلا لیا۔ اس اضافے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان سب کے شہری انداز نے گانو کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ رنگوں کی آمیزش اور

کپڑوں کی تراش خراش میں ذرا نفاست شروع ہو گئی۔

پرانی پیڑھی والیاں زیادہ تر ان پڑھ تھیں۔ قرآن شریف، نماز اور تسبیح کے سوا لکھنے پڑھنے سے معذور تھیں۔ ان دنوں بھی چند شوقین خوش حال خواتین دوسروں سے ڈپٹی نذیر احمد کی "مراۃ العروس" اور "بنات النعش" پڑھوا کر سنا کرتی تھیں۔ راہِ نجات، نورنامہ وغیرہ کے علاوہ ایک بوڑھی بیوی ہمیشہ قصہ یوسف زلیخا پڑھا کرتی تھیں۔

۴ بجے رات سے تو اس گھر میں ہنگامہ بجتا تھا۔ ایک لونڈی اٹھ کر وضو کے لیے پانی گرم کرتی۔ ساری بیویوں کے لوٹے ان کی چوکیوں پر پہنچا دیے جاتے۔ نماز وظیفہ کے بعد سورج نکلتے ہی منجھلے دادا انگلیوں کی پور پر وظیفہ پڑھتے ہوئے اندر آتے۔ بڑی دونوں بھاوجوں اور بہنوں کو سلام کرتے ہوئے مکان کے دوسرے حصے میں اپنی مخصوص جگہ متمکن ہو جاتے، جہاں ان کی بیٹی فریدہ اور دو نوکرانیاں چائے کا پتیلہ چیڑھا چکی ہوتی تھیں۔ تام چینی کی بڑی بڑی پیالیوں میں کشمیری چائے انڈیل کر کشتیوں میں سجا کر بھاوجوں، بہنوں، بیٹوں اور بہوؤں کو پہنچائی جاتی تھی۔ میں خود ہی وہاں پہنچ جاتی تھی تاکہ فریدہ کے ساتھ مزیدار چائے اور سموسہ کھا سکوں۔ سب کے بعد وزیرن بوا بھی اپنے خاندان کے چائے نوش فرماتیں۔

چائے کے بعد دادا کے اکلوتے بیٹے اٹھ کر پڑوس کے گھر میں چلے جاتے جہاں دوستوں کے ساتھ شطرنج، رمی اور فلش کا دور چل پڑتا۔ اسکول کی چھٹیاں گزارنے کا شکار اور کھیل کے سوا کیا مشغلہ ہو سکتا تھا۔ مدرسہ کیا شروع ہوا، لڑکیوں کی دلچسپی کا ایک ذریعہ ہو گیا۔ استانیاں بھی بڑی رنگین مزاج آئیں، جنھیں پڑھائی سے زیادہ طلسم الفت، قصہ حاتم طائی ہیرا من توتا سے دلچسپی تھی۔ لیکن کچھ بھی ہو، لڑکیوں کی پڑھائی، امتحان

اور تبدیلی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

۱۵

ایک سال تک تنہا رہنے کے بعد جب مسولی آتی تھی تو جی خوش ہو جاتا تھا۔ اگلے برس پہنچی تو یہاں شادی پھیلی ہوئی تھی۔ مہینے بھر سے گانے بجانے کا سلسلہ قائم تھا۔ شاید ہی کوئی رشتہ دار یا دوست بچا ہو جو اِس شادی میں مدعو نہ کیا گیا ہو۔ لڑکیوں اور لڑکوں کے مجمع میں گھری دلچسپی کے ساتھ ان عجیب و غریب رسومات کو دیکھ رہی تھی جو شادی کے ایک ہفتہ پہلے سے شروع ہو گئی تھیں۔ سنجھلے دادا کے اکلوتے بیٹے کی شادی تھی، اور میری دادی جو دولھا کی بڑی چچی تھیں، پوری طرح ماں کی کمی پوری کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ دیور سے ان کا جھگڑا بھی ہوتا مگر بات انھیں کی بالا رہتی۔ اس شادی میں پہلی بار کچھ لوفر قسم کے لڑکے ملے۔ کچھ عاشق مزاج لڑکیاں نظر آئیں۔ چند ایسی داستانیں سننے کو ملیں، جو انتہائی حیران کن تھیں۔ اللہ اِن اونچی اونچی دیواروں کے اندر ایسی ہستیاں بھی موجود ہیں جو خطوط کی پتنگ اڑاتی ہیں۔ غیروں سے چھپ کر ملتی ہیں اور بہ ظاہر سیدھے سادے نوجوان رات کی تاریکیوں میں ایسا ہنگامہ بھی بچا دیا کرتے ہیں جس سے سارے گھر میں ہلچل مچ جائے۔

دوسرے دن میراثن کی وہ چمکتی ہوئی لڑکی پورے مجمع کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ مگر یہ سب کیا تھا۔ دیر تک ہم دونوں سہیلیاں

سر جوڑے پھُس پھُس کرتی رہیں۔ آخر ہم دونوں نے یہ طے کیا کہ یہ بہت بری لڑکی ہے۔ اتنا اچھا گاتی ہے، مگر راتوں کو کوٹھے پر گھومتی پھرتی ہے۔ اس سے ہم کبھی بات نہ کریں گے۔ حالانکہ وہ ایک ہفتے سے اپنی سریلی آواز میں گیت، غزلیں اور ٹھمریاں گا کر سارے مہمانوں کا دل موہ چکی تھی۔ برات کے ساتھ ناچنے والی چلی گئی اور بھانڈ بھی، اس لیے ہم کچھ بھی نہ دیکھ سکے۔ لڑکی والے دو دن محظوظ ہوئے۔ ہمیں ارمان ہی رہا۔

لیکن یہ حسرت چند ہی ماہ بعد اپنے اکلوتے ماموں جان کی شادی میں پوری ہو گئی۔ وہاں دُلھن والے سیّد زادے پیرزادے تھے، اس لیے انھوں نے منع کر دیا کہ ہمارے گھر طوائف اور بھانڈ وغیرہ کوئی نہ آئے۔ اپنے گھر ناچ رنگ کر لو، یہاں نہ لانا۔

ناچار سارا جشن دلھن کی آمد پر اسی گھر میں ہوا۔ مسولی سے دو کوس پرے چھوٹے سے گانو بھیارہ[۱] میں جنگل میں منگل کئی دن چلتا رہا۔ ہزار ہا جوڑے رعایا کو تقسیم ہوئے۔ پندرہ دن مہمان نوازی کرنے، ناچ گانے اور مرغن غذاؤں سے مہمانوں کا پیٹ بھرنے کے باوجود میری نانی رو رہی تھیں کہ آج لڑکے کے باپ زندہ ہوتے تو نہ جانے کیا کیا ارمان نکالتے مجھ سے تو کچھ بھی نہ ہو سکا۔ حالانکہ قابلِ تعریف بات یہ تھی کہ بغیر کوئی دستاویز لکھے اور اراضی رہن رکھے اتنی بڑی تقریب انھوں نے کر ڈالی تھی اور اس عظیم الشان جشن کے قصے زبان زدِ خلائق رہے تھے۔

۱۔ اس گانو کو میں نے مختصر ہی دیکھا مگر روایت یہ تھی کہ "بارہ گانو قدوارہ سب سے بڑا بھیارہ"

(۱۶)

۱۹۱۴ء کے شروع ہوتے ہی ہمارے گھر پر سیاست کے سایے منڈلانے لگے۔ پہلے ایک اخبار آتا تھا اب کئی کئی انگریزی اور اردو اخبارات نظر آنے لگے۔ مولوی صاحب اردو داں مجمع اور اپنے شاگردوں کو اردو اخبارات کی خبریں سناتے اور ماسٹر صاحب مہمانوں اور انگریزی داں طالب علموں کو جوش و خروش سے اخبار پڑھ کر سناتے تھے۔ پھر اس پر تبصرہ ہوتا۔ پہلی جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ میرے والد کانگرس اور مسلم لیگ کونسل دونوں کے ممبر تھے، اس لیے اس گھر میں نہ جانے کیا کچھ ہوا کرتا تھا۔ فالسہ کے شربت سے بھرے ہوئے گلاس کشتیوں میں لگ کر باہر جانے لگتے تو دل چاہتا تھا ان کے ساتھ میں بھی چلی جاؤں۔ دیکھوں وہاں کیا ہو رہا ہے۔ مگر اب میرا پردہ شروع ہو چکا تھا، نوکروں سے صرف ڈیوڑھی میں بات کر سکتی تھی۔

انھیں دنوں مجھے اپنی زندگی میں پہلی کتاب تحفہ میں ملی۔ مولوی مسعود علی صاحب ناظم دارالمصنفین جنھیں میں مسعود ماموں کہتی تھی، سرخ سرورق کی موٹی سی کتاب "صبح زندگی" مصنفہ راشد الخیری، میرے لیے لے کر آئے۔ مسعود ماموں ہمارے ننہیال وغیرہ میں سے تھے اور اکثر آیا کرتے تھے۔ ماں تو ان سے پردہ کرتی تھیں، لیکن مجھ پر خاص شفقت فرماتے تھے۔ میری تعلیم سے بھی دلچسپی لیتے تھے۔ کتاب دے کر کہنے لگے، دیکھو اس کو

ضرور پڑھنا۔ یہ صرف لڑکیوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ کتاب پاکر عجیب سی خوشی اور فخر محسوس ہوا۔

اور پھر ایک دن اس گھر میں بکثرت مہمان جمع ہوئے۔ صحن اور کمرے کھچا کھچ بھر گئے اور میں اپنے ذوقِ تجسس کو روک نہ سکی۔ پردے سے لگ کر میں نے دیکھ ہی لیا۔ دو شاندار آدمی کلپاک ٹوپیوں پر ہلال لگائے ہوئے اور شیروانی پر "خادمِ کعبہ" کا بیج ٹانکے بہت سے لوگوں کے ساتھ لکھنؤ سے آئے تھے یہ محمد علی اور شوکت علی تھے (اس وقت تک وہ مولانا نہیں ہوئے تھے) بڑے جوش و خروش کے ساتھ بارہ بنکی میں انجمن خدام کعبہ کی بنیاد پڑی۔ میں بحث و مباحثہ کی آوازیں سن رہی تھی، مگر جانے کی اجازت بھلا کہاں مل سکتی تھی؟ بس دل مسوس کر رہ گئی۔ لڑکے کود رہے تھے۔ مجمع میں گھل مل رہے تھے اور میں یہ جاننے کے لیے بے تاب تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ناچار انھیں سے ایک بیج مانگ کر میں نے بھی اپنی اوڑھنی پر ٹانک لیا۔ ابھی نہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تھی، نہ ریڈیو پر ملھار گانے کی آواز بلند ہوئی تھی، نہ فضا میں ہوائی جہازوں کی گھڑگھڑاہٹ کا شور تھا اور نہ موٹروں کے ہارن قصبے کی سڑک پر بجے تھے۔

لیکن بہت جلد فضا میں ہوائی جہاز نظر آنے لگے۔ جہاز بھی کیا تھے بس جیسے آج کل کے ہیلی کاپٹر۔ جوں جوں جنگ بڑھتی گئی، ہمارے مولوی صاحب حکومت برطانیہ کی پریشان حالی پر ملول ہوتے گئے۔ اس بابرکت انگریزی راج کو وہ خدا کی مہربانی سمجھتے تھے۔ بلکہ اکثر اس طوائف الملوکی کا ذکر کرتے تھے، جس سے ہندستان ۱۸۵۷ء اور اس کے لگ بھگ دو چار رہا تھا۔ وہ ہمیں سناتے تھے کہ ہندستانی باغیوں نے انگریز عورتوں اور بچوں تک پر رحم نہیں کیا تھا۔ ظالم باغی بچوں کو اچھال کر سنگینوں پر روک لیتے تھے۔ مولوی صاحب کا خیال تھا اس ظلم کی

سزا ہندستانیوں کو یہ ملی کہ سارے ملک پر انگریز بہادر کا تسلط ہوگیا۔ انھیں دنوں خواجہ حسن نظامی کے لکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے کتابچے بھی آئے۔ صرف ایک شعر یاد رہ گیا۔

دعائیں یہ کرتے ہیں لیٹے ہوئے
کہ جرمن کی توپوں میں کیڑے پڑیں

اور واقعی وفادارانِ حکومت لیٹے ہوئے دعائیں کر رہے تھے۔ انھیں یقین تھا، برٹش حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا۔ یہ فتح بھی انگریز کی ہوگی۔ ادھر ماسٹر صاحب بالکل ان کی ضد تھے۔ انگریزوں کی ہار کی خبر پڑھتے ہی کرسی سے اچھل پڑتے۔ اپنی پاٹ دار آواز میں "وہ مارا" کہہ کر خلاصہ سناتے اور کہتے "دیکھا ان سالے انگریزوں کو۔ قیصر جرمنی کیسا مزا چکھا رہا ہے۔ ذرا اس کو اور آگے بڑھنے دو، دیکھ لینا ایک دن ہندستان چھوڑ کر ان حرامزادوں کو بھاگنا پڑے گا۔"

ماسٹر صاحب ۱۹۲۱ء میں سول نافرمانی کر کے جیل بھی گئے۔ اپنے ان تمام شاگردوں پر ان کو فخر تھا جو کانگریس تحریک میں شریک ہوئے ۱۹۵۰ء میں وہ دہلی آکر کچھ دن رفیع بھائی کے پاس ٹھہرے۔ اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

قابلِ تعریف تھیں اُن دنوں اودھ کی عورتیں۔ وہ دنیا مافیہا سے بے خبر اپنا گھر، اپنے بچے، شادی، غمی کی رسومات میں مگن تھیں۔ ویسے برادری کے بندھن بھی ان دنوں سخت تھے۔ رشتہ دار رشتہ دار ہوتا تھا۔ اور بہن کی نند کا دیور ہو یا سسر وہ بھی آؤ بھگت کا مستحق تھا۔ ذرا سی کمی پر وہ برادری میں میزبان کی ناک کٹوا سکتا تھا۔

میری ماں کے میکے سے آنے والے ہندو مسلم افراد ہمیں روپے ضرور

دیتے تھے۔ غریب عورتیں بھی جب آتیں دودھ، گھی، جوار کے لڈو، لائی کے ستو اور اِملی کی مزیدار ٹکیاں ہمارے لیے لاتیں۔ مگر کوئی ہندو مرد یا عورت ہمارے گھر پانی پینے کی بھی روادار نہ ہوتی۔ مرد اناج لے کر رسوئی بنانا پسند کرتے تھے۔ میرے اعتراض پر ماں نے بتایا کہ ہندوؤں میں اپنے گانو کی یا گھر کی بیٹی جہاں بیاہی ہو، وہاں خالی ہاتھ نہیں جاتے اور اس کے گھر کھانا پینا بھی برا سمجھتے ہیں، کیوں کہ بیٹی یا بہن پورے گانو کی بیٹی بہن مانی جاتی ہے، تم سلام کر کے ضرور لے لیا کرو۔ ان احسانات کے بدلے میں میرے والد ان کے مقدمے مفت لڑتے تھے اور والدہ ان کے سردیوں کی جڑاول اپنے ہاتھ سے تیار کر کے انھیں پہناتی تھیں۔

اُفوہ، کتنے چاندی کے زیورات نانی میرے لیے بنوا کر لاتی تھیں اور میں ایک دو دن پہن کر انھیں کنڈم کہہ دیتی تھی۔ شاید ان دنوں بیویوں کا بہترین مشغلہ زیورات بنوانا، بدلنا، بیچنا اور کپڑوں کی سلائی اور چمک دمک تھا، یا پھر ساس نندوں سے لڑنے، محلے ٹولے کی اچھی بری سن گن رکھنے اور چھالیا کترنے، پان چبانے میں وقت گزرتا تھا۔

شاید میرے والدین اس معاملے میں منفرد تھے۔ ماں کے ہلکے پھلکے زیور اور ہلکے رنگ کے نفیس کپڑے، ادبی ذوق اور اس دور کی سیاست نے مِل جُل کر اس گھر کو قدیم و جدید کا سنگم بنا دیا تھا۔

حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہی کنجوس عورتیں جو اِستری دھن کے نام سے پیسا پیسا جوڑ کر سونا چاندی اکٹھا کرتی تھیں، نام و نمود کے لیے انعام اور جوڑے بانٹتے اور کسی مصیبت زدہ کی مدد کرتے وقت ایسی فیاض اور دریا دل ہو جاتی تھیں کہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ شاید اِن تضاد کی وجہ خلوص، خوفِ خدا اور سیدھی سادی مذہبیت تھی۔

اللہ کیسی بھولی بھالی وہ بیویاں تھیں کہ اب سوچو تو تعجّب ہوتا ہے وہ نہیں جانتی تھیں سرکس کس کو کہتے ہیں، تھیٹر کس چڑیا کا نام ہے۔ موٹر کیسی ہوتی ہے اور ریل کیا چیز ہوتی ہے۔

بساط خانہ، چوڑیاں، کپڑے، زیورات سب ہی بیوپاری عورتوں کے ذریعے گھروں کے اندر آجاتے تھے۔ ہم لوگ کوٹھے پر چڑھ کر گلا بوشتابو کا تماشا، کٹھ پتلی کا کھیل اور بہروپیوں کے نت نئے سوانگ دیکھ لیا کرتے تھے۔

ایک قصبے میں سرکس آیا۔ خلقت دیکھنے کے لیے اُمنڈ پڑی، مگر مسلم گھرانوں کی لڑکیاں تڑپ تڑپ پڑیں، مگر ان کو اجازت نہ ملی۔ ایک صاحبزادی نے اپنے پرانے نوکر سے کہا۔ "بابا ہمیں وہ جانور ہی دکھا دو جو سرکس میں کرتب کرتے ہیں؟ نوکر کو بھی ترس آگیا۔ اس نے کہا اچھّا۔ جب جانور اِس راستہ سے گزر کر ندی پر پانی پینے اور نہانے جائیں گے، تو میں چھوٹی بی بی کو پکاروں گا۔ بس تم سب بالا خانہ پر جاکر دیکھ لینا۔

معینہ وقت پر نوکر نے پکارا۔ چھوٹی بی دیکھو تو کتنا بڑا بھالو جا رہا ہے۔ اس اشارے پر بڑی لڑکیاں تو اوپر بھاگیں اور پانچ سالہ چھوٹی بی یہ کہتی ہوئی دوڑیں "کیا بڑا بھاری بھالو ہے؟" نوکر نے کہا "ہاں بہت بھاری ہے" لڑکی آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "بڑا بھاری ہے؟ ہماری امّاں سے بھی زیادہ بھاری ہے" اور اس کی لحیم و شحیم امّاں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ہائے اللہ یہ نگوڑ ماری تو نوکروں تک سے میرے مٹاپے کا بکھان کرتی ہے۔

۱۷

نو دس سال تک پھرتے رہنے کے بعد اب جبراً کونے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ اس لیے صرف کتابیں پڑھنے، ماسٹر صاحب کی کمنڑی سننے اور بھائیوں سے لڑنے میں لطف آتا تھا۔ قوم، ملّت، وطن جیسے الفاظ کے معنی و مفہوم بھی بساط بھر ذہن نشین ہو چکے تھے۔ لیکن بعض اوقات انگریزی، اردو اخبارات، مسلم لیگ، کانگرس اور اس دور کے سیاسی لیڈر اور پیر پیغمبر سب دماغ میں گڈمڈ ہو جایا کرتے تھے۔ مولانا محمود حسن اور حسین احمد مدنی مالٹا میں نظر بند ہیں۔ محمد علی شوکت علی چھندواڑہ میں محبوس ہیں۔ مولانا حسرت موہانی چکّی پیستے ہوئے گا رہے ہیں۔

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
ایک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

اور اقبال کا شکوہ، جوابِ شکوہ، خضرِ راہ وغیرہ ہم سب زبانی یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپس میں بیت بازی کے وقت اس پر فخر ہوتا تھا کہ کس کو زیادہ اچھے اشعار یاد ہیں۔ ساتھ ہی حشر و نشر، جنّت و دوزخ کا تصور بھی اپنی دنیاوی سوجھ بوجھ کے مطابق ہمارے اندر خوف اور ذوق دونوں جذبے بیدار کر رہا تھا۔

کبھی خبر سنتے کہ آغا خاں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے چندہ جمع کر رہے

ہیں۔ کبھی افواہ اڑتی کہ آج میرے والد کی کلکٹر ضلع سے ہندی اردو کے مسئلے پر زبردست جھڑپ ہو گئی اور وہ ضلع کا بڑا افسر اُن سے ناخوش ہو گیا ہے۔ چھٹیوں میں جب رفیع بھائی مع اپنے احباب کے گھر آتے تو گرماگرم سیاسی، تاریخی اور ادبی مباحث چھڑ جاتے۔ سجّاد انصاری مرحوم اپنے حسنِ مذاق کی بدولت سیاسی سے زیادہ ادبی و تاریخی موضوع پر رائے زنی کرتے تھے۔

نہ جانے کب مولانا عبدالماجد کا ڈراما زود پشیماں آیا اور مجھ سے چھپا کر لوگوں نے پڑھا۔ عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناول رکھے تھے، مگر میرے لیے شجرِ ممنوعہ تھے۔ حتّٰی کہ عبدالوالی صاحب کے رسالہ، معلومات، میں ایک مسلسل افسانہ، جمیلہ کی ناکامیابی، چھپ رہا تھا، وہ تک مجھے پڑھنے نہ دیا گیا۔ ناچار مجھے چوری اور سینہ زوری کا چسکا پڑ گیا۔ میرے والد کے مضامین ان دنوں جمہور[1]، صداقت[2] اور کامریڈ[3] و ہمدرد[4] میں شائع ہوتے تھے۔ شاید مزاج کی یہ قسم میری سمجھ سے باہر تھی۔ صرف تہذیبِ نسواں[5] اور ظلّ السلطان[6] فوراً مجھے دے دیے جاتے تھے۔ ایک انگریزی ہفتہ وار "نیو ایرا" بھی دو سال تک آتا رہا۔ پھر اس کے ایڈیٹر راجا غلام حسین ایک حادثے کا شکار ہو کر فوت ہو گئے، اور غالباً ۱۹۱۷ء میں بند ہو گیا۔ راجا غلام حسین کی موت سے کئی دن تک گھر میں فضا غمگین رہی۔

ضلع کے حکّام والد کی دونوں سیاسی[7] پارٹیوں کی شرکت، ڈاکٹر انصاری

---

[1] قاضی عبدالغفار مراد آباد سے نکالتے تھے۔
[2] صداقت الہ آباد سے نکلتا تھا۔
[3]، [4] مولانا محمد علی کے انگریزی و اردو اخبارات
[5] اڈیٹر محمدی بیگم لاہور
[6] بیگم بھوپال کی سرپرستی میں بھوپال سے شائع ہوتا تھا۔
[7] کانگریس اور لیگ

سجاد حیدر، شعیب صاحب وغیرہ اور علی برادران کی دوستی کی وجہ سے ناراض تھے کچھ دن پہلے اس دور کی ہلکی پھلکی سیاسی سرگرمیوں کی اور اردو ہندی قضیہ میں والد کی مخالفت کی رپورٹیں ان کو مل چکی تھیں، اس لیے خفیہ پولیس ان کی نگرانی کر رہی تھی۔ کسی قدر تشویش کے آثار، نظر بندی، جیل وغیرہ کے لیے تیار رہنے کے تذکرے گھر میں اکثر سُنا کرتی تھی، لیکن ان باتوں سے ہم میں کوئی متاثر نہ تھا۔

۱۸

خواب و خیال جیسی بہت سی یادوں میں ایک ایسی شام بھی ہے، جب میرا چھوٹا بھائی بوا کی گود میں تھا اور میں ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ گھر سے کچھ دور سڑک پر ایک میلی سی گٹھری پڑی دیکھ کر میں نے اُسے ٹھوکر ماری، پوٹلی بڑے زور سے کراہی اور بوا نے ڈانٹا۔ ہائیں کیا کرتی ہو۔ آدمی کا بچہ ہے ٹھوکر نہیں مارتے۔ پھر وہ اس کے پاس بیٹھ کر اس سے بات کرنے لگیں۔ کچھ کہا۔ کچھ سمجھایا اور اس پوٹلی میں سے ہاتھ پیر نمودار ہو گئے جو بہت گرم تھے۔ چیتھڑے ہٹے اور ایک گندی سی لڑکی لڑکھڑاتی ہوئی ہمارے ساتھ چل پڑی۔ وہ مجھ سے اس وقت کافی بڑی تھی۔ لیکن میں اپنی اس دریافت پر اتراتی اتراتی پھر رہی تھی کہ اسے میں لائی ہوں۔

دواؤں سے دوسرے دن اس کا بخار اُتر گیا۔ اور میری ماں نے ایک عورت کے ہاتھوں خود کھڑے ہو کر اسے گرم پانی صابون اور بیسن سے نہلوایا۔

ٹھیکروں سے کھرچ کر اس کا میل کچیل دور کیا گیا۔ کسی کا کرتا کسی کا پائجامہ پہن کر اور گلابی اوڑھنی اوڑھ کر وہ کوئلہ جیسی لڑکی گندمی رنگ بڑی بڑی آنکھوں والی قبول صورت لڑکی بن گئی۔ چند دن کی کھلائی پلائی نے رنگ خوب نکھار دیا۔ ایک ہی مہینے کے اندر بارہ تیرہ سال کی لڑکی نوکروں سے چہلیں کرنے لگی۔ حالانکہ میں بہت خوش تھی، ہر وقت اسے ساتھ رکھتی تھی، نام نرگس رکھا گیا۔

ایک دن تو وہ میرے ساتھ مکان کے اس حصے میں پہنچ گئی، جہاں سب رشتہ دار طالب علم رہتے تھے۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ چھوٹی چھوٹی کنکریاں اُچھلنے لگیں۔ ہنسی قہقہے پھوٹ پڑے اور میں نے ماں سے چغلی کھائی کہ نرگس وہاں سب کو کنکریاں مارتی ہے۔ اس دن چند تمانچے مار کر اسے تاکید کی گئی کہ خبردار اب کبھی اس حصۂ مکان کا رخ نہ کرنا۔

کچھ روز بعد تعلیم و تربیت کے لیے وہ اتی جان (نانی) کے پاس بھیج دی گئی۔ تقریباً ایک سال کے بعد وہ واپس آئی تو بھڑکدار چھینٹ کا غرارہ اور سرخ دوپٹّا اوڑھے ہوئے وہ بیاہی عورت تھی۔ ایک چھچھورا سا نوجوان اس کے ساتھ تھا، جسے فوراً رفیع بھائی کے پاس نوکر رکھ کر علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ میں نے کہا نرگس تیرا میاں تجھے بلا رہا ہے۔ یہ سنتے ہی اس نے کھنکھار کر تھوک دیا۔ وہ اسے سخت ناپسند تھا۔ نرگس کا رنگ روپ نکھرتا گیا، مگر اس شوہر کو اس نے کبھی منہ نہ لگایا۔ اُسے تو صرف ہمارا طرحدار خدمت گار پسند تھا۔ آخر کار ایک رات وہ غائب ہو گئی اور اب تین سال بعد وہ واپس آئی تھی، ہم سب نے اسے گھیر لیا۔

اب وہ خدا باپ اور عیسیٰ مسیح کی قسم کھاتی تھی۔ سایہ پہنتی تھی اور عیسائی مشنریز نے اسے حضرت عیسیٰ کی بھیڑوں میں شامل کر کے

سکھا دیا تھا کہ "اے آسمانی باپ جیسے تیری مرضی آسمانوں پر پوری ہوتی ہے، زمین پر بھی پوری ہو، ہماری آج کی روٹی ہمیں دے"۔

لیکن ہم سب بھائی بہنوں کا اصرار تھا۔ نرگس ہمارے پاس لوٹ آئی۔ وہ آگئی۔ مگر اب انداز بہت ہی بیباکانہ ہو چکا تھا۔ تقریباً ایک سال تک رنگ رلیاں بکھیر کر میرے والد کے طرحدار ملازم کو لے کر وہ پھر چمپت ہو گئی۔ دوسرے سال ملازم صاحب تو دیوہ کے میلے میں اپنی داڑھی گیروے کپڑوں میں پیر بن کر نمودار ہو گئے، مگر نرگس پھر واپس نہ آئی، نہ پھر اُس کی خیر خبر ملی۔ سب کے لیے وہ بھولی بسری ہو گئی لیکن میرے دل میں اُس کی یاد باقی رہ گئی۔ آج جب ویمن سروس ہوم کی لڑکیوں کی تعلیم، سدھار اور معیار زندگی پر غور کرتی ہوں تو خیال آتا ہے، کاش ہم نے اسے بھی تھوڑی سی آسانیاں مہیا کر دی ہوتیں تو شاید اس کی برباد زندگی سنور جاتی۔

ایک دن میری ماں نے بتایا کہ آج مجھے اپنی ان رشتہ کی خالہ کے گھر جانا ہے، جو چند دن پہلے ہمارے گھر آچکی تھیں اور ان کے شوہر شہر کے سینیئر وکیل تھے وہ بہت اصرار سے کہ گئی تھیں کہ ان کی لڑکیاں ان سے ملنا چاہتی ہیں، مگر بڑی لڑکی بیمار ہے، اس لیے وہ آ نہیں سکتی۔

پہلی بار تنہا مہمان بن کر کہیں جانا بڑے فخر اور خوشی کی چیز تھی۔ جلدی جلدی تیار ہو کر ڈولی میں بیٹھ گئی۔ ایک ماما اور رمضان بابا مع لاٹھی کے میرے ساتھ گئے۔ ظاہر ہے اتنی شان سے جب اس گھر میں اُتری تو فخر سے گردن اونچی ہو گئی۔ خالہ مجھے صحن ہی میں مل گئیں۔ خوب لپٹایا۔ اظہار مسرت کیا اور کہا چلو تمھیں حبیبہ کے کمرے تک پہنچا دوں۔ وہ بچاری تو پیر میں پھوڑا لیے پڑی ہے۔ چل نہیں سکتی۔

حبیبہ کے پاس اس کی دو چھوٹی بہنیں، دو تین نوکرانیوں کی لڑکیاں اور شاید ایک دو کوئی رشتہ دار لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ بڑی بے تکلفی سے

حبیبہ نے مجھے اپنے ہی پلنگ پر بٹھا لیا اور باتیں شروع کر دیں۔

اپنی باتیں، پڑوسیوں کے تذکرے، گانوّ کے قصے، عشق مجازی کی داستانیں، بھوت پریت کی کہانیاں، ٹونے ٹوٹکے، عیاش مردوں کا ذکر۔ اُفوہ کتنی باتیں ان لڑکیوں کو معلوم تھیں۔ اس دن پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ میں ان سب کے مقابلے میں کس قدر بے وقوف ہوں۔

بھوتوں کی کہانیاں میرے گھر میں ممنوع تھیں۔ ٹوٹکے کبھی دیکھے ہی نہ تھے۔ یہ سن کر کہ ڈائن ٹونا مار کر مردوں کو الو بنا دیا کرتی ہے اور بھوتنی ناک میں بولتی ہے، ان کے پنجے پیچھے اور ایڑیاں آگے ہوا کرتی ہیں، خوف سے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ حبیبہ نے صرف ایک سال مجھ سے بڑی ہونے کے باوجود سب کچھ آنکھوں دیکھا تھا۔ اور جب وہ لوگ یہ بتانے لگیں کہ منشی نے اپنی بہو کو گھر میں رکھ لیا ہے، تب مجھ سے نہ رہا گیا، "یہ بھلا کون سی بات ہوئی۔ گھر میں نہیں تو کیا بہو کو باہر رکھتے۔" میری حماقت پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ انھوں نے جو کچھ بتایا اسے میں باور نہ کر سکی۔ کسی آدمی کے دو بیویاں تھوڑی ہوتی ہیں۔ حبیبہ کا اصرار تھا کہ ایک رنڈی تو سب کے ہوتی ہے۔ ہمارے ابا کے بھی ہے۔ اس گھر میں نہیں آتی ہے۔ ہم لوگ اس کے پاس جایا کرتے ہیں۔

رنڈی کیسی ہوتی ہے؟ میرے اس سوال پر پھر سب نے قہقہہ لگایا کیسی ہوتی ہے؟ تمھیں نہیں معلوم؟ ہٹو تم تو بالکل بدھو ہو۔

واقعی میں بدھو تھی۔ مگر شام کو جب معلومات کا اتنا بڑا ذخیرہ لے کر گھر واپس آئی اور ان لوگوں کا ایک آدھ جملہ ماں کے سامنے دُہرایا، بلکہ مختصر سی رپورٹ سنائی تو وہ بہت جز بز ہوئیں اور شاید اسی وجہ سے مجھے کبھی پھر وہاں نہ جانے دیا گیا، حالانکہ میں ان عقلمند، ہزار داستان

لڑکیوں سے ملنے کے لیے بے تاب رہا کرتی تھی۔

(۱۹)

۱۹۱۷ء کی ابتدا میں میری والدہ سخت بیمار ہوئیں اور انھیں علاج کے لیے لکھنؤ لے جایا گیا۔ دو چھوٹے بھائی بہن ساتھ گئے اور میں دو بھائیوں سمیت خالہ کے پاس چھوڑ دی گئی۔ یہ کوٹھی ابھی تیار ہوئی تھی اور وسیع و عریض باغ میں بکثرت پھول، پھل اور درخت تھے۔ ان کی دونوں چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ کھیل کود کا بھی خوب موقع تھا۔ گڑیاں کھیلنا اب میرے لیے کسرِ شان تھا، لیکن دل نہ مانتا اس لیے وہ مجھ سے چھوٹی تھیں۔ گڑیاں کھیلتیں اور میں پھولوں کے عرق میں چونا ملا کر نت نئے رنگ سے گڑیوں کے کپڑے رنگتی۔ لیکن گھبرا گھبرا کر اس دن کا انتظار کرتی رہتی جب حسبِ وعدہ مجھے بھی بلایا جاتا۔

آخر کار امّی جان (نانی) آئیں اور مجھے لکھنؤ لے گئیں۔ جس دن جانا تھا اس سے ایک دن پہلے انھوں نے میرے والد کو سمجھایا کہ لڑکی کو ماں کے پاس جانے دو۔ وہ کوئی غیر جگہ نہیں ہے۔ میرے بھائی کا گھر ہے۔ انھیں شاید یہ اعتراض تھا کہ وہاں ملنے جلنے، دیکھنے بہت لوگ آئیں گے۔ پھر بھی انھوں نے کہہ دیا۔ آپ اگر ٹھیک سمجھتی ہیں لے جائیے۔ امّی جان کو ان کی اس قدامت پسندی پر تعجب تھا۔ کہنے لگیں آخر لڑکی میں کیا بُرائی ہے، جو اتنا چھپا کر رکھی جائے۔

اپنی عمر میں پہلی بار گھوڑا گاڑی پر اتنا لانبا سفر۔ جی اندر سے خوش ہو رہا تھا اور تصور میں لکھنؤ کے نئے نقشے بن رہے تھے۔

لیکن گھر دیکھ کر اوس پڑ گئی۔ وہ تو ہمارے اور خالہ کے دونوں گھروں سے چھوٹا، اونچی اونچی دیواروں سے گھرا ہوا مکان تھا۔ اس میں بہت سے لوگ تھے۔ لیکن میری دلچسپی کی صرف ایک چیز تھی۔ وہ امّی جان کے بھائی کی اکلوتی لڑکی جمیل تھی۔ بہت جلد ہم دونوں میں گہری دوستی ہو گئی، کیونکہ ہم عمر بھی تھے۔ جمیل کو اپنے لکھنوی ہونے پر، اپنی زبان و تہذیب پر ناز تھا۔ انھیں بہت سے اشعار یاد تھے۔ لکھنوی شعرا کا کلام بھی حفظ تھا۔ الماری میں بہت سی کتابیں تھیں۔ ان کے باپ ڈپٹی کلکٹر تھے، اس لیے بہت سے شہروں میں اپنے والدین کے ساتھ جا چکی تھیں کیوں کہ جلد جلد تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ نیا مکان بھی قریب ہی بن رہا تھا۔ وہ لوگ کچھ عرصے کے لیے یہاں مقیم تھے، حالانکہ یہ محلہ دگانوان بالکل دیہات کا منظر پیش کرتا تھا مگر نام لکھنؤ کا تھا۔

اکثر ہماری بحث و تکرار بھی ہو جاتی۔ ایک بار جمیل نے کہا، وکیل کوئی بہت بڑے تھوڑی ہوتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب کو وہ حضور کہہ کر عدالت میں مخاطب کرتے ہیں۔

یہ سن کر میرے سخت چوٹ لگی۔ یہ بات بھی لے کر ماں کے پاس پہنچی کہ کیا وکیل ڈپٹی لوگوں کے نوکر ہوتے ہیں جو انھیں حضور کہتے ہیں۔ ماں نے سمجھایا، نہیں وکیل تو عدالت کو مائی لارڈ، حضور کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ کسی خاص آدمی کی نہیں، کرسی کی عزت ہوتی ہے۔ چلو اتنے ہی سے میری تسکین ہو گئی۔

دو ہی چار دن بعد مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محل کے خاندان کی بہت سی خواتین عیادت کو آئیں۔ مولانا موصوف کی بیوی میری ماں کی سگی

خالہ تھیں۔ وہ اس سے پہلے بھی آچکی تھیں۔ اتنے بڑے عالم دین کی بیوی ہونے کی وجہ سے ان کی خود اہمیت تھی۔ لیکن آج تو ان کے ساتھ کئی بیویاں تھیں۔ ہم دونوں لڑکیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ دالان، جس میں پردے پڑے ہوئے ہیں، اس میں اس وقت تک مقیم رہیں جب تک کہ مہمان خواتین چلی نہ جائیں۔ غصّے اور رنج کے مارے میرا برا حال تھا۔

آنے والیاں خوب موٹی لانبے عربی وضع کے کرتوں میں ملبوس تھیں۔ دو جوان شادی شدہ لڑکیاں بھی زیورات اور چمکدار کپڑوں میں دلھن بنی ہوئی ساتھ تھیں۔ چند بچّے تھے اور ہم پردے کی اوٹ سے انھیں دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے لانبے کرتے، ٹاٹ بافی جوتیاں ہمیں عجیب سی لگیں۔ یہ سب حج کر چکی تھیں۔ لانبا کرتا تو ہماری امّی جان بھی پہنتی تھیں، لیکن ان کے کچھ زیادہ فیشن ایبل تھے شاید ان دنوں حج کے بعد لباس میں تبدیلی ضروری تھی۔

گفتگو شروع ہوئی، تو "اے ہے" "اوئی اللہ" "اس کی جان سے دور یار" "دست بخیر" جیسے جملے سن کر طبیعت اور بھی للچائی کہ کاش یہ فصیح گفتگو ہم بھی سنتے۔ مہمان بیویوں نے میری ماں پر سے صدقہ اتارا۔ ادھر ہم دو ننھی پنچھی اپنے قفس میں پھڑ پھڑاتے رہے اور تب ہم نے سوچا کسی طرح ہماری بھی شادی ہو جاتی تو ان محفلوں میں شامل ہو سکتے۔ کتنا احمقانہ خیال تھا۔ پھر ہم دونوں اس حماقت پر خوب ہنسے۔

شام کو رخصتی کے وقت انھوں نے ہم دونوں کو دیکھنا ضروری سمجھا۔ سب کی سب بے تکلف اس دالان میں آگئیں۔ ہمیں لپٹایا، دعائیں دیں اور رخصت ہو گئیں۔ مگر اس زبردستی دخل اندازی کا بزرگوں نے بہت برا مانا۔ ہما۔ بچاری جمیل کے چہرے پر ایک پیدائشی لچھن[۱] تھا۔

۱۔ نیلا سیا گول دھبا جو آنکھ کے قریب سے ہوتا ہوا گال تک آگیا تھا۔ ان دنوں کوئی پلاسٹک سرجری کا نام بھی نہ جانتا تھا۔ اس لیے زندگی بھر چہرے کو داغدار بنائے رہا۔

شاید اسے لوگوں کی نظر سے چھپانا ضروری تھا۔

لیکن اس ایک واقعے نے میرے باغیانہ جذبات کو ابھار دیا۔ اب میں نے کونے میں بیٹھنے سے صاف انکار کر دیا۔

مرد رشتے دار آتے یا عورتیں، ماں گھورتی رہتیں اور میں جھٹ آگے بڑھ کر سلام کر لیتی۔ ایک دفعہ تو میں نے واقعی حد کردی۔ رشتہ میں بزرگ عزیزوں کی تو بات دوسری تھی اور اس پر زیادہ اعتراض بھی نہ تھا، ایک پھپھی، خالہ کے جوان بیٹوں سے بھی ملاقات کر لی جو عیادت کو آئے تھے اور ان میں سب سے بڑے کی عمر شاید سولہ سال تھی، مگر وہ سب جوان، سیانے کہے جاتے تھے۔ سرزنش کا نشانہ ضرور بنی، مگر مجھ پر اثر نہ ہوا۔ تین ماہ کے قیام میں دوستوں اور رشتہ داروں کے سارے کنبوں سے واقف ہو گئی۔ امّی جان کی ایک قریبی رشتہ دار شیعہ خاتون کے گھرانے سے تو خوب راہ رسم بڑھ گئی۔ جمیل نے تنبیہہ کی کہ ان کا بڑا بیٹا بہت لوفر ہے اس سے بات نہ کرنا۔ لیکن اس جاہل لڑکے سے بات کرنے کی خواہش ہی کسے تھی۔ میں تو اب اپنے کو بہت قابل تصور کرنے لگی تھی۔ اعزا میری بیمار ماں کو اکثر کتابیں دے جاتے تھے اور ہم دونوں اس میں حصّہ دار تھے۔

ویسے اس شیعہ خاندان سے قربت و دوری کا عجیب امتزاج تھا جوں ہی ماتم و مرثیہ اور آہ بکا کی آوازیں آتیں، اس گھر میں لوگ بڑ بڑانے لگتے کہ اب تبرّا ہو رہا ہو گا۔ مگر امّی جان بڑے خلوص سے ٹبّو بیگم سے گلے ملتیں اور ماں سے تو ان کی گہری دوستی تھی۔ تحائف کا سلسلہ بھی چلتا رہتا۔ لوگ ناک بھوں چڑھا کر کہتے۔ مفت کی دولت ہے، لٹا رہی ہیں۔ تعلقہ دار صاحب کا اکلوتا پوتا چونکہ دادا کی زندگی میں باپ کے مر جانے سے محجوب الارث قرار پایا گیا تھا،

اس لیے ان بیٹی صاحبہ کو علاقہ مل گیا ہے، گلچھرے اُڑا رہی ہیں۔

اسلامی شریعت کے اس عجوب والے مسئلے پر اس وقت تو میں غور نہ کر سکی، اتنی صلاحیت ہی نہ تھی، برسوں بعد مفتی عتیق الرحمان صاحب سے اسے سمجھنا چاہا تو انھوں نے کہا۔ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ وصیّت کر کے مرے اور وصیّت انھیں کے لیے ہے جو براہ راست وارث قرار نہیں پاتے۔ مثلاً بیٹا، بیٹی، بیوی، بہن وغیرہ یہ تو سب وارث ہی ہیں۔ وصیّت ایسے ہی افراد کے لیے ہے، جن کے محجوب یا خارج ہونے کا خدشہ ہو۔

لیکن ابّا جان (امتیاز علی) عالم یا مفتی نہ تھے۔ جب ان کے چچیرے بھائی کے دو نوجوان بیٹوں کا انتقال ہو گیا اور وہ ننھے بچے چھوڑ کر رخصت ہو گئے تو ابّا جان نے اپنے کزن کو مجبور کیا کہ وہ جایداد میں اُن بچّوں کا حق قائم کر دیں۔ دو زندہ بیٹوں کے ساتھ دو مرحوم بیٹوں کی اولاد کو بھی برابر کا مستحق قرار دیں اور اپنے سامنے ساری لکھا پڑھی رجسٹری کرا کر ان سب کو اور دونوں بیواؤں کو اس قابل کر دیا کہ وہ دادا کے مرنے کے بعد کسی کے محتاج نہ ہوں، میرا خیال ہے اسلامی شریعت کا صحیح حکم یہی تھا، جس پر عمل کیا گیا۔

علماء نے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ مجھے ایک اور متشرع حاجی اور قابل احترام بزرگ بارہ بنکی ضلع کے یاد آتے ہیں، جنھوں نے اپنے تین بیٹوں میں سے ایک کے فوت ہو جانے پر مرحوم بیٹے کی بیوہ اور تین بچّوں کو یک قلم وراثت سے خارج کر دیا تھا اور ہم جیسے لوگ اس سوچ میں پڑ گئے تھے کہ شریعت کا یہ کیسا ظالمانہ فیصلہ ہے کہ یتیم بچّے ٹھوکریں کھائیں۔

سچ پوچھیے تو یہ کٹر مذہبی قسم کے زمیندار صرف اپنے لڑکوں کو

جایداد کا مالک بنا کر بیٹیوں کو مفلس و قلاش چھوڑ جایا کرتے تھے۔ کتنے سخت قلب والدین تھے جو اپنی لڑکیوں کو مصیبت میں مبتلا دیکھنا گوارا کر لیتے تھے اور جایداد کا تیا پانچا گوارا نہ تھا۔

بات میں بات نکل آئی۔ ہاں تو میں لکھنؤ کا ذکر کر رہی تھی۔ اس بار نہ ہم نے لکھنؤ کے قابل دید مقامات دیکھے، نہ بیگمات سے ملاقات کی۔ بس انگور سیب کھائے اعزا سے ملاقاتیں ہوئیں اور بہت سی نئی شائع ہونے والی کتابیں پڑھیں۔ ان میں صرف تین کے نام یاد رہ گئے۔

۱ عورتوں کی انشا " مصنفہ بیگم صفدر علی

۲ شوکت آرا بیگم " ایک کاکوری خاتون غالباً والدہ" عبدالرؤف عباسی

۲ بچیوں سے دو دو باتیں " بیگم خواجہ حسن نظامی

انھیں دنوں میرے ماموں جان جو خاندان میں سب سے زیادہ مجھے پسند تھے، آ گئے اور ان کی بیوی کے ایک بہت خوبصورت بیٹا پیدا ہو گیا، اس لیے قیام کچھ اور طویل ہو گیا۔

اس ہنگامے میں ایک روز اور اضافہ ہوا جب امّی جان کی سب سے چھوٹی شاندار بہن مہارانی کی طرح آکر مع اپنے ضعیف العمر رعشہ زدہ شوہر کے اُتر پڑیں۔ رام پور کے جدید ترین فیشن کے کپڑے، سادگی و امارت کا بہت خوبصورت امتزاج اور اپنے انداز و اطوار میں اتنی پُرکشش بیگم تھیں کہ ہم دونوں بہت خوش ہوئے۔

میں نے کہا جمیل وہ کون ظالم تھا جس نے میرے ماموں جان سے بھی عمر میں کم اتنی اچھی خالہ کی قسمت ان بڑے میاں کے ساتھ پھوڑ دی۔ آخر انھوں نے خود انکار کیوں نہ کر دیا۔

مگر جمیل تو اپنے پھوپی پھوپا پر فدا تھی۔ انھیں بُرا لگ گیا۔

صبح چائے کے وقت جب انھوں نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے چائے کی پیالی تھامی تو میں وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ بھلا غضب ہے، دولت پر قربانی، اور تب میں نے سوچا میری شادی اگر کوئی ایسے آدمی سے کرنے کو کہے گا تو مزا چکھا دوں گی۔

واقعہ یہ ہے کہ میں اب شادی کی بات بھی سوچ لیتی تھی کیونکہ جو آتا وہ کہتا، "افوہ اتنی بڑی ہو گئی۔ کہو، کہیں سے بات ٹھہری۔ لڑکی سیانی ہو رہی ہے، اب فکر کرو۔" اور یہ سب سن کر ایسا جی جل جاتا کہ جی چاہتا کہنے والے کا منہ نوچ لوں۔

ان میں سے کوئی یہ نہ پوچھتا، کس اسکول میں پڑھتی ہو۔ کون سے درجے میں ہو۔ سب مجھے گھر گرہست عورت بنانے کی فکر میں مبتلا تھے۔

والدہ کو صحت ہوتے ہی ہم سب بارہ بنکی روانہ ہو گئے۔

(۲۰)

وہ ایک ہولناک دن تھا۔ اندر سے باہر تک عورتیں اور مرد گھر میں بھرے تھے اور سب کی آنکھ میں آنسو تھے۔ جولائی کا مہینہ، شدید گرمیوں کے دن تھے۔ بارہ بنکی اور لکھنؤ کے کئی ڈاکٹر حکیم جمع تھے۔ میری ماں اور امی جان دروازے کی اوٹ سے بار بار جھانک کر دیکھتیں اور آنکھوں میں آنسو بھرے واپس آجاتی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی

دیر بعد پردہ کرایا جاتا۔ دادی پھوپھی اور رشتہ دار عورتیں باہر کے ہال کمرے میں جاکر مریض کو دیکھ آتی تھیں، جہاں میرے باپ ہیضہ کے مرض میں مبتلا لیٹے تھے۔

ان کی عمر تینتیس ۳۳ سال کی تھی۔ گھونگھرالے سیاہ بال، بلند پیشانی سرخ و سفید رنگ، اچھے خوبصورت جوان تھے۔

مجھے یاد ہے اس زمانے کی گہری پابندیوں اور مصنوعی شرم و حیا کی بدولت میری ماں دور کھڑی ہو کر ان کو دیکھتیں۔ دادی بلائیں لیتیں پھوپھی سینہ پر سر رکھ دیتیں، مگر بیوی جس کا سب کچھ لٹ رہا تھا اپنی آہوں کو سینہ میں دبائے جذبات کا گلا گھونٹ رہی تھی۔

ابھی دو ہفتہ پہلے سارا خاندان گاؤں میں ہیضہ پھیل جانے کی وجہ سے بھاگ کر شہر چلا آیا تھا اور صرف ایک دن پہلے عمو جان (میرے والد) نے اعلان کر دیا تھا کہ کل رفیع کا نکاح کر دیا جائے۔ سات سال سے منگنی طے تھی۔ چھوٹے چچا کا اصرار تھا کہ جلد شادی کرو۔ یہاں باپ چچا راضی نہ ہوتے تھے۔ وہ تعلیم ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ دادی کہتیں، تم دونوں بھائی تو لڑکوں کو بوڑھا کر کے بیاہو گے۔ شادی کی یہی عمر ہوتی ہے۔ مگر نہ جانے اس دن کیا ہوا کہ اس روز انھوں نے نکاح کا اعلان کر دیا۔ کچھ طبیعت سست تھی اس رات کھانا بھی نہ کھایا۔ صرف انار کے دانے کھا کر دن گزار دیا۔ آواز پر ہلکا اثر پاکر دادی نے پوچھا تو کہا ذرا پیٹ خراب ہو گیا ہے۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ سنتے ہی دادی کے کان میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی، مگر شادی کے انتظامات جاری رہے۔ سونے کا سہرا، صندل کے پیے چاندی کی ڈبیاں، تاروں اور پھول کے گجرے، سرخ تمامی کے جوڑے، سب کا بندوبست ہوتا رہا۔ چچا نے آکر

کہا" ولایت میاں عقد ملتوی کرو۔ تمھاری طبیعت ٹھیک ہو جائے تب دیکھا جائے گا۔" مگر انھوں نے نہ مانا۔

وہ خاندان میری خالہ اور خالو (نواب علی وکیل) کے گھر مقیم تھا۔ وہیں ہم سب جمع ہو کر دلھن کو منہدی لگوا رہے تھے کہ چھوٹے دادا روتے ہوئے آئے اور کہا، بند کرو یہ سب قصہ اور رسومات۔ میرا جوان بھتیجہ اچھا ہو جائے تو کچھ ہوگا ورنہ نہیں۔

اور میں بھاگتی ہوئی گھر پہنچی تو یہاں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اعزہ و احباب کی بھیڑ تھی۔ جیسے سارا شہر اُمڈ آیا تھا۔ شام تک حالت اور ابتر ہو گئی۔ سہ پہر کو خبر ملی کہ ڈاکٹر انصاری لکھنؤ پہنچ گئے ہیں۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق میرے والد کو بھی اس میٹنگ میں شرکت کرنا تھی۔ لکھنؤ پہنچ کر علالت کی خبر ملی تو چودھری خلیق الزّماں کو لے کر بارہ بنکی آئے۔ کالرا کی کوئی نئی دوا نکلی تھی جس کا اِنجکشن وہ دینا چاہتے تھے۔ مگر دوا نہ مل سکی۔

جب وہ بارہ بنکی پہنچے تو آخری وقت قریب آچکا تھا۔ جو متبادل دوا مل سکی تھی اس کا انجکشن لگانے میں بھی دشواری پیش آرہی تھی۔ رگ نہیں مل رہی تھی۔ پانی چڑھانا چاہا تو ہلکا سا شگاف دینا پڑا اور تقریباً بارہ بجے شب میں پانچ بچے (جن میں ایک صرف دو سال کا تھا) اور ۲۸ سالہ بیوہ چھوڑ کر انھوں نے اجل کو لبیک کہا۔

اِنجکشن کے بعد سب انھیں سکون دینے کے لیے ہٹ کر دوسری سمت چلے گئے تھے۔ صرف شفیع صاحب بیٹھے ان کے پیر سہلاتے رہے اور ماں کوٹھے پر سے دیکھ رہی تھیں۔

اُنھوں نے کیسے اتنی دور سے دیکھ لیا؟ کیسے ان کی سمجھ میں آگیا کہ وقتِ جدائی قریب ہے۔ بس دل کی لگی ہی کہیے۔ سیڑھیوں

سے گرتی ہوئی کو ان کی والدہ نے سنبھال لیا اور میرے سوچنے سمجھنے کی طاقت سلب ہو گئی۔ ہم سب مردانے صحن کی طرف دوڑے۔ اکبارگی سب کی آواز سن کر والد پلنگ پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے اپنی بہن کو پکارا۔ کچھ کہا اور سر تکیے پر گر گیا۔ ڈاکٹر انصاری دوڑے ہوئے آئے اور ایک نظر دیکھا اور خاموش واپس چلے گئے۔ شفیع صاحب زمین پر بیٹھ کر رونے لگے۔

وہ رات جب دو گھوڑوں والی بگھی پر ہمارا لٹا ہوا قافلہ گانو[2] واپس جا رہا تھا اور ایک انبوہ ہمارے پیچھے پیدل چل رہا تھا، شاید میرے دماغ میں ہمیشہ کے لیے یہ بات مرتسم ہو گئی۔ اس رات ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ کتنی مقبول ہستی کا جنازہ تھا، جسے نو میل تک لوگ اپنے کاندھوں پر لے گئے تھے۔ ان کاندھا دینے والوں میں گانو، شہر، دوست، رشتہ دار سب تھے۔ راستے میں چھوٹے چھوٹے دیہات پڑے، جن سے لوگ ساتھ ہوتے گئے اور رونے والوں میں بچوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ ان میں دو وہ ننھی بچیاں بھی تھیں جو چند ماہ ہوئے اپنی بیوہ ماں مسز عبدالوحیدؒ کے ہمراہ اپنے چچا سے ملنے آئی تھیں اور ہمارے ساتھ مقیم تھیں۔

تجہیز و تکفین میں شرکت کے لیے دور دور سے لوگ آئے۔ کچھ رو رہے تھے کہ اب ہماری خبر گیری کون کرے گا۔ طالب علم روتے تھے کہ اب ہماری تعلیم کیسے جاری رہے گی۔ دوست ان کی خوش مذاقی اور فراخ دلی کا تذکرہ کرتے اور ابّا جان خاموش آنسو بہا رہے تھے۔ بیوائیں کہتیں آج ہم لاوارث ہو گئے نہ جانے کیا ہوا، اس رگ

---

[1] بہار کے رہنے والے میرے والد کے کلاس فیلو جوان مرگ ڈپٹی کلکٹر تھے۔

سے مرنے کے بعد بھی خون جاری رہا اور کفن پر سرخ دھبہ نمودار ہوگیا جسے دیکھ کر چھوٹے دادا نے "ہائے میرا شہید بیٹا" کہہ کر سر پیٹ لیا۔

وہ رواج اور رسموں کا زمانہ تھا۔ پورے چالیس دن صبح و شام میری دادی ان کا نام لے کر رونا شروع کرتیں۔ پاس پڑوس سے سب رشتہ دار جمع ہو جاتے، پھر فاتحہ ہوتا۔ ایک گھنٹہ یہ سلسلہ جاری رہتا۔ ان چالیس دنوں تک گھر میں کڑھائی نہیں چڑھی۔ کوئی دعوت نہیں ہوئی اور تمام عرصہ آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ اور امّی جان اپنی غمزدہ بیٹی کو لیے بیٹھی رہیں۔ وہ حتی الامکان نئے آنے والوں کی یورش سے اپنی بیٹی کو بچائے رہتی تھیں۔ مگر مشکل یہ تھی، بیوہ کا پلنگ عدّت ختم ہونے تک اس جگہ سے ہٹ نہیں سکتا تھا اور ایک سال تک وہ اپنے میکے بھی نہ جا سکتی تھیں۔ بچے اپنی کھلائی اور انّا کے سپرد تھے، بھائیوں کو تو تمام دن ابّا جان اپنے پاس رکھتے۔ طویل چھٹی لے کر وہ گھر پر مقیم تھے۔ کیسے درد ناک اشعار پڑھا کرتے تھے اور جب خطوط آنا شروع ہوئے تو پتا لگا کہ مرنے والے نے بہت سے گھروں کی ویرانی میں خوشیاں بکھیرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک مرحوم دوست کے بیوی بچوّں کی مدد کرنے کے علاوہ ان کی بچی کے بیمہ تک کی رقم بھجواتے تھے، تاکہ شادی کے وقت پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔

کتنا کما لیتے تھے۔ کتنا خرچ کرتے تھے اور کتنا قرض لیتے تھے۔ یہ سب ابّا جان کو دیکھنا تھا۔

دادی تو اس صدمہ کے بعد صاحبِ فراش ہی رہیں۔ ان کا جسم اتنا بے حس ہو گیا تھا کہ میں اور فریدہ جب ان کے پیر دبانے بیٹھتے تو آپس میں چمپی کی آواز اور کمالِ فن کا مظاہرہ ہوتا۔ وہ خاموش پڑی رہتیں۔

آخر ایک دن پھوپھی نے ان کے پیر دیکھے تو دھک سے رہ گئیں۔ ہماری سٹھیوں کے تال سُر نے ان کی پنڈلیوں پر خون کے جمنے کے سیاہ اور نیلے نشان ڈال دیے تھے۔

جب حالت زیادہ ابتر ہوئی تو تقریباً چھ ماہ بعد انھوں نے ابّا جان کو بلا کر کہا کہ اب میری زندگی کا کچھ ٹھیک نہیں۔ رفیع کا نکاح کر کے اپنے بھائی کی آخری خواہش پوری کردو۔

رفیع بھائی تار دے کر علی گڑھ سے بلائے گئے۔ چچا کی موت کے بعد وہ اتنے دل شکستہ تھے کہ تار پا کر سمجھے کوئی نئی مصیبت آئی ہے۔ گھر پہنچ کر حقیقتِ حال کا علم ہوا تو چچی کے گھٹنے پر سر رکھ کر رونے لگے۔ شاید انھیں وہ منحوس دن یاد آگیا۔

اسی دن شام کو چُپ چپاتے شادی ہو گئی۔ دعوت ولیمہ بھی نہیں ہوئی کیونکہ گھر میں ابھی غمی تھی، لیکن ہم سب کی خوشی کی حد نہ تھی۔ اپنی گڑیا سی بھاوج کو سجانے اور اِدھر سے اُدھر لے جانے میں خاصا لطف آتا تھا۔ چچی نے بڑی فراخ دلی سے شادی کی رسومات میں حصّہ لیا۔ مگر دادی بستر سے اُٹھ نہ سکیں۔ آخر کار ایک سال بیٹے کے فراق میں تڑپ کر اپنے مولا سے جا ملیں، اور اب میری ماں اس محبت و سرپرستی سے محروم ہو گئیں جو دادی سے حاصل تھی۔

اس عرصے میں حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ میری تعلیم کا سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا۔ اگرچہ مولوی صاحب اب ہمارے ساتھ اسی گانو میں چلے آئے تھے اور گھر کے سب ہی چھوٹے بچوّں کو پڑھاتے تھے۔

(۲۱)

گانو کا ماحول اتنا نامانوس اور تکلیف دہ تھا کہ مجھے کافی گرم و سرد سے گزرنا پڑا۔ یہاں شریف اور کمین، رزیل اور کم ذات کے الفاظ اکثر سننے کو ملتے تھے۔ اس دور میں ایک طبقہ تو تعلقہ دار راجا اور زمینداروں کا تھا جو برٹش گورنمنٹ کے عہدہ دار خطاب یافتہ لوگ ہوا کرتے تھے۔ دوسرا خدمت کرنے والے کا تھا۔ مزدوروں کا طبقہ بھی یہی تھا۔ ان میں کا ہر آدمی بھوک سے مجبور ہو کر مزدوری کر سکتا تھا، مگر شریف آدمی غربت میں امرا کے دست کرم پر انحصار کرتا۔ مزدوری کرنا سبکی سمجھتا تھا۔ اسی لیے مشہور تھا کہ نواب آصف الدّولہ نے قحط کے ایّام میں لکھنؤ کا بڑا امام باڑہ رات کو بنوانا شروع کیا تاکہ شرفا، اگر ضرورتاً محنت مزدوری کریں تو دن کی روشنی میں ہم چشموں کے سامنے رسوا نہ ہوں۔ خزانۂ شاہی کا بڑا حصّہ مزدوری کی شکل میں عوام تک تقسیم کر دینے کا انھیں بعد مردن بھی یہ صلہ ملا کہ برسوں بعد بھی لکھنؤ کے دکاندار صبح یہ کہہ کر بیوپار شروع کرتے تھے "جس کو نہ دے مولا، اس کو دلوائیں آصف الدّولہ"

ایک مزدوری اور بھی دیہات میں رائج تھی جسے بیگار کہا جاتا تھا۔ چھوٹے بڑے ہر زمیندار کو یہ حق تھا کہ وہ نیچی ذات یا ہریجن رعایا کو کسی وقت بھی کام کے لیے پکڑ بلاتا اور اُسے اپنا ضروری کام چھوڑ کر زمیندار مالک کی بیگار کرنی پڑتی تھی۔ اگر مالک رحم دل ہے تو

بھُنے ہوئے چنے، گڑ اور چند پیسوں سے ان کی تواضع بھی کر دیتا تھا ورنہ محنت اس کا فرض تھا، اُجرت کی ادائیگی لازمی نہ تھی۔

مجھے یاد ہے گھر کے جانوروں پر ایک چمار کام کرتا تھا۔ اس کی بہن روزانہ اناج وغیرہ پھٹکنے آیا کرتی تھی۔ بالکل جوان لڑکی چار بچوّں کی ماں بن چکی تھی۔ وہ پورا دن کام کرنے کے بعد تین آنا پیسے اور اناج سے نکلی فضولیات لے کر گھر واپس جاتی تھی۔ اللہ ہی جانے وہ چھے آدمی اس میں کیا کھاتے پہنتے ہوں گے۔ البتہ سردیوں میں اِسے روئی دار شلو کا اور بچوّں کو پُرانے کپڑے مل جایا کرتے تھے۔ یہ بہت بڑی فیاّضی تھی۔

ہریجنوں میں سے چمار، کھیت اور گھروں میں مزدوری کرتے۔ جوتے گانٹھتے، کچّے مکانوں کی مرمّت کرتے اور مردہ جانوروں کے گوشت سے اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ مہتر صرف صفائی کرتے اور کھیتوں میں کھاد ڈالتے تھے۔ گانو میں "بنس پھوڑ"[1] ایک قوم بھی آباد تھی، وہ سور پالتے۔ بانس کی ٹوکریاں، سرپوش پنکھے وغیرہ بناتے تھے اور دیہاتی ڈاکیا بھی وہی تھے۔ دوسرے گانو چٹھی رسانی کے لیے انھیں کئی کئی کوس دوڑا دیا جاتا اور اُجرت میں صرف دو تین آنا دے دیے جاتے تھے۔ سور پالنے کی وجہ سے وہ بھی اچھوت تھے، مگر ان کی عورتیں بچّہ جنانے، بچوّں کے کپڑے دھونے اور زچہ کی دیکھ ریکھ کا کام کرنے کی وجہ سے انعام و اکرام کی مستحق سمجھی جاتی تھیں۔ بچےّ کا نال بھی وہی کاٹتی تھیں۔

سب سے دلچسپ قوم پاسیوں کی تھی جو عموماً شاطر چور ہوا کرتے تھے۔ مگر ہمیشہ گھروں کی چوکی داری کا کام ان کے سپرد کیا جاتا

---

[1] بانس پھوڑنے والے

اس زمانے کے عام دستور کے مطابق ان کی بھی ایک برادری اور اس کے کچھ بائی لاز ہوا کرتے تھے۔ ان میں ایک قانون یہ تھا کہ جس گھر میں برادری کا کوئی فرد نوکر ہو، وہاں چوری نہ کرو۔ نمک کھا کر نمک حرامی گناہِ عظیم تھی۔

سنتی ہوں میرے دادا نے اپنے معتبر چوکیدار منگل سے کہا کہ وہ ایک بار انھیں دکھا دیں، کیسے کمند پھینکی جاتی ہے۔ کس طرح موٹی دیوار میں سیندھ لگتی ہے۔ منگل نے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ گانو کے سب سے اونچے محل کی چھت پر صرف ایک رسّی کی مدد سے چڑھ کر دکھا دیا۔ اس نے کہا میں تو شروع سے آپ کے یہاں ملازم ہوں، مگر ہمارے یہاں ہر بچّے کو اس کی ٹریننگ ضرور ملتی ہے، اس لیے یہ فن مجھے بھی آتا ہے۔

پیشہ ور طبقوں میں مراؤ اور کبڑیے[1] بھی تھے، جو صرف ترکاریاں بوتے اور بیچتے تھے۔

خانہ بدوش قبائل کی بھی کثرت تھی۔ بلوچی تو خیر کبھی کبھی آتے تھے۔ مگر نٹ رسیّوں پر چل کر تماشہ دکھاتے۔ کبڑیے اپنا ٹھاٹھ اور جانور لیے اکثر آکر پڑاو ڈال دیتے تھے۔ صبح صبح وہ قصائی کی دکان، بلکہ کمیلے میں اپنے پیالے لیے ہوئے پہنچ جاتے اور ذبح ہونے والے جانوروں کے خون سے پیالہ لبالب بھر لیتے اس میں نمک مرچ ڈال کر تھوڑی آگ دکھا دیتے اور یہی ان کا سالن ہوتا تھا۔ ان کی عورتیں سونج کی ٹوکریاں بنا کر بیچتی تھیں اور وہ خود سادھو مہاتما کا ڈھونگ رچا کر پیسا کماتے تھے۔ الٰہ آباد کنبھ کے میلے میں ایک بار ایک عزیز نوجوان کو سنگم پر مرگ چھالا بچھائے ہوئے ایک سادھو ملا۔ وہ کسی قدر پہچان کر اس کے قریب گئے تو دیکھا، آٹا، پیسا، گڑ

---

[1] کنجڑے

اور ناریل کا ڈھیر لگا ہوا ہے اور اپنے گانو کا کبڑیا عجیب نامانوس زبان میں منتر پڑھ پڑھ کر عورتوں اور بچوں کو گنڈے دے رہا ہے۔

اس نے بھی پہچان کر منہ پھیر لیا اور اپنے کاروبار میں مصروف ہوگیا۔ جب یہ کچھ دور نکل گئے تو دوڑا ہوا آیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا، بھیّا کسی سے کہنا نہیں، اپنی تو یہی کمائی ہے۔ یہ کہہ کر الٹے قدموں لوٹ گیا۔ گانو میں ملاقات ہوئی تو قہقہہ لگاتا رہا۔

ایک قوم اور بھی خانہ بدوشوں کی تھی جو سانپ، مینڈک، چوہے وغیرہ کھاتے اور آوارہ گردی کرتے رہتے تھے۔ مگر ان کی طرحدار کنجریاں بازاروں میں ناچ گا کر دیہاتیوں کا دل لبھاتیں اور پیسا بٹورتی تھیں۔ یہ لوگ جونک بھی پالتے تھے۔ ان دنوں ویدک اور یونانی طریق علاج میں فاصد خون نکالنے، بلڈ پریشر کم کرنے کا واحد ذریعہ جونک یا سنگی لگانا تھا۔

ایک خاص قسم کے لال لال آنکھوں والے فقیر بھی آیا کرتے تھے۔ جنھیں دیکھتے ہی عورتیں بچّوں کو گھروں کے اندر بند کر دیتی تھیں کیونکہ یہ اگھوری یعنی تانترک فقیر تھے۔ جادو ٹونا کرکے بھیک مانگا کرتے تھے۔

کسان بھی ہریجنوں سے کچھ بہت اونچی سطح پر نہ تھے۔ زمیندار کے حکم پر وہ اپنی محنت سے تیار کی ہوئی فصل سے بے دخل کیے جا سکتے تھے اور ان کی داد فریاد کہیں نہ تھی۔

خود بال بال قرض میں بندھے ہوئے اور مہاجنوں کے سود در سود میں جکڑے ہوئے زمیندار جوتے اور ڈنڈے مار کر ان کاشتکاروں سے اکثر پیشگی لگان وصول کر لیتے تھے، چاہے اُن غریبوں کو اپنے بیل اور گھر کا سامان کیوں نہ رہن رکھنا پڑے۔

اگر سب گنا بوتے تو زمینداروں کے لڑکوں کا حق تھا کہ

جب چاہیں، کھیت سے توڑ لیں اور تہواروں پر تو خود لے کر آتے تھے۔

جب رس نکالنے کا وقت آتا، تو زمیندار صرف اپنے لیے نہیں دوست احباب کو تحفہ دینے کے لیے بھی بیسیوں گھڑے اس سے لے کر رساول پکانے اور سرکہ ڈالنے میں صرف کر دیتا۔ اسی طرح گڑ بناتے وقت پہلی پاری جس کا وزن ایک من سے کم نہ ہوتا تھا، زمیندار کا حق تھی۔ اس زمین کا کرایہ بھی وصول کرتا جس پر کولہو کھڑے کیے جاتے۔

جوار کے بھٹے، ککڑی، ہرے چنے، مٹر کی پھلیاں، غرض کھیت کی ہر پیداوار میں زمیندار کا نہ سہی اس کے کارندے کا حصہ ضرور ہوتا تھا۔

پاس پڑوس کے تمام زمینداروں کے گھر یہ سب چیزیں بہ افراط نظر آئیں۔ مگر ہمارے گھر نسبتاً سوکھا پڑا رہتا۔ میرے استفسار پر بتایا گیا کہ دلوا نے یہ سب کاشتکاروں کو معاف کر دیا ہے۔ تہوار پر بھی صرف کایستھ اور سناروں کی دعوت قبول کر کے پکوان لے لیتے ہیں اور گڑ صرف کولھو والی زمین کے کرایے میں وصول کیا جاتا ہے، باقی سب معاف ہے۔ بیگار کے بدلے عام ریٹ سے کم، مگر مزدوری ضرور دی جاتی ہے چونکہ ان کا اثر اور رعب بہت تھا، اس لیے گانو کے سب چھوٹے زمینداروں کو بھی یہی طریقہ اپنانا پڑا۔

اسی طرح ہندو رعایا کی تکلیف کے خیال سے ہمارے گھر تو گائے کی قربانی نہ ہوتی تھی، لیکن اور سارے گانو میں عام رواج تھا اور اسے ہرگز روکا نہیں جا سکتا تھا، کیونکہ یہ شریعت میں مداخلت تھی۔

(۲۲)

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں، اب مشکلات کا دور شروع ہو چکا تھا۔ ابتدا میں تو رشتہ داروں نے انتہائی محبت و خلوص برتا، پھر رفتہ رفتہ نکتہ چینیاں شروع ہوئیں۔ ہنسنا، زور سے قہقہہ لگانا، دوڑ کر چلنا، اپنے چچیرے بھائیوں سے سگے بھائیوں کی طرح قربت، لباس، عادات و اطوار، کتابیں پڑھنے میں وقت گزاری، کیرم، لوڈو، تاش وغیرہ میں لڑکوں کے ساتھ شرکت، سب ہی قابلِ اعتراض باتیں تھیں۔

مجھے گھر کے کاموں، کھانا پکانے وغیرہ سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ کبھی میرے باپ نے مجھ سے ایک گلاس پانی نہ مانگا تھا۔ کبھی باورچی خانہ میں قدم نہ رکھا تھا، اس لیے مردوں کی خدمت کا کوئی جذبہ اپنے اندر تھا ہی نہیں۔

یہاں لڑکیاں سارا گھر سر پر اُٹھائے تھیں۔ باپ بھائیوں کے تو سارے کام انھیں سے متعلق ہوتے تھے۔ مجھے فہمائش کی جاتی کہ یہ سب سیکھو، ورنہ پرایے گھر میں کیسے بسر ہوگی۔ بڑی چچی[1] تو اس حد تک آگے بڑھ جاتیں کہ دیکھ لینا الٹی ڈولی واپس آئے گی۔ کون اس پھوہڑ لڑکی کو سوارت کرے گا۔

---

[1] جو بعد کو میری ساس بن گئیں۔

سلائی آتی تھی، مگر دل کب لگتا تھا۔ پڑوس کے گھر میں لیٹی ہوئی اپنی سہیلی فریدہ کے ساتھ کتابیں پڑھتی رہتی۔ شعر و شاعری سے بھی ذوق بڑھ رہا تھا۔ والد کی موت کے بعد مذہبی رجحان بھی شدّت اختیار کر گیا تھا۔ با معنی قرآن شریف، احادیث، شرع و فقہ سب کی طرف متوجہ ہونے کے ساتھ ساتھ، طلسم ہو شربا، فسانۂ عجائب، باغ و بہار، میر حسن کی مثنوی، انیس و دبیر کے مرثیے، سب ہی پڑھ ڈالے۔

اس درمیان میں رفیع بھائی نے دارالمصنفین سے اپنا تعلق قائم کر لیا۔ ان کے اور ماموں جان کی بدولت ہر نئی کتاب مل جاتی تھی۔ رفیع بھائی آتے جاتے اکثر انگریزی ناولوں کے ترجمے (تیرتھ رام فیروز پوری کے سہی) مگر لے آتے تھے۔ فارسی استعداد بڑھانے کے لیے جب شعرالعجم[1] کی طرف رُخ کیا تو الجھن میں پڑ گئی۔ ناچار لغت کی مدد سے سلسلہ شروع کر دیا۔

البتہ انگریزی پڑھنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، کیونکہ اب سارے لڑکے ابّا جان کے ساتھ ان کی نوکری پر رہتے تھے۔ نہ جاتے تو یہاں گانو میں سوا پرائمری مدرسہ کے اور کون سا اسکول تھا۔ رفیع بھائی و شفیع صاحب دونوں علی گڑھ میں تھے۔ ۱۹۱۸ء کا سال ان دونوں بھائیوں کا برباد ہو چکا تھا۔ ابّا جان اُن کئی طالب علموں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے، جن کی کفالت میرے والد کرتے تھے۔ بچارے رفیع بھائی کو گھر کی حالت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اس لیے کچھ دن وہ ایسے منی آرڈر بھی ضرورت مندوں کو بھجواتے

---

[1] مولانا شبلی نعمانی

رہے جو والد کے انتقال پر بند ہو گئے تھے۔

آخر کار انھیں یہ معلوم ہی ہو گیا کہ جایداد سود در سود کی بڑھتی ہوئی رقم سے بوجھل ہو چکی ہے اور جلد فکر نہ کی گئی تو مہاجنوں کی یورش ہو جائے گی۔ اس میں اپنی ہی برادری کے ایک راجا صاحب بھی مہاجنوں کے شریکِ کار تھے۔

اور تب ایک ایک کر کے گانو فروخت ہونا شروع ہو گئے۔ مشکل یہ آن پڑی کہ ہر دستاویز یا رہن جو ہوتا تھا، اس پر دونوں بھائی دستخط کر دیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آدھی سے زیادہ زمینداری فروخت ہو کر سب قرض ادا ہوا۔ بقیہ قرض ابّا جان نے اپنی جایداد پر لے کر بھتیجوں کے حقوق محفوظ کر دیے۔ ان سب کاموں میں شفیع صاحب نے باپ کا بار ہلکا کرنے میں مدد کی۔

(۲۳)

۱۹۱۹ء کے آخر میں جب دادی مرحومہ آخری لمحات سے گزر رہی تھیں، تو انھوں نے حکم دیا کہ میرا نکاح بھی کر دیا جائے۔

عقد کا یہ سادہ شرعی انداز رفیع بھائی اور ابّا جان کی مرضی سے ایسا انجام پذیر ہوا کہ عرصے بعد اسے قبولیت عام حاصل ہو گئی۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ سب کی زمینداریاں لبِ بام تھیں اور عدالت سے کسی انصاف کی امید نہ تھی۔ ان حالات نے سب کو مجبور کر دیا کہ دل کے ارمان دبائے جائیں۔ سائیں بچاری کلیجا مسوس

کر بیٹھ گئیں اور دھڑا دھڑ یہ نوچی کھسوٹی شادیاں ہونے لگیں۔

شاید خاندان میں پہلی لڑکی میں تھی جس سے شادی کے بارے میں پوچھا گیا۔ رائے لی گئی، ان الفاظ کے ساتھ کہ تمھارے مرحوم باپ کی بھی نیت تھی اور مرتی ہوئی دادی کی یہ خواہش ہے۔

میری جیسی چودہ سالہ لڑکی اور کیا کہہ سکتی تھی کہ جیسی آپ لوگوں کی مرضی، لیکن ابھی دو سال نہ کیجیے تو اچھا ہے۔ بھلا اِسے کون مانتا۔

لباس میں کسی قدر میری پسند کا لحاظ رکھا گیا اور اس زمانے کی تمام فضول رسومات سے میری جان بچ گئی۔ وہ پیشواز پہن کر پوٹیا پوٹیا چلنا۔ ہفتوں گھر کے بزرگوں سے بات نہ کرنا، ہر وقت گوٹے ٹھپّے زیور میں لدے رہنا، مجھ سے کہاں برداشت ہوتا۔ دوسرے ہی دن بے حیائی کے چرچے عام ہو گئے اور دو ہی چار دن بعد میں اپنے پرانے سادے کپڑوں میں نکل پڑی۔

خاندان کے بزرگ حیران، ماں متفکر، لیکن رفیع بھائی خوش۔ ابّا جان مسرور اور میں مطمئن تھی۔

لیکن یہ تجربہ کچھ بہت اچھا نہ رہا۔ چند ہی تیار جوڑے مجھے مل سکے تھے۔ کسی کو اب فکر بھی نہ رہی اور جب کسی تقریب میں جانا ہوتا تو مجھے کپڑوں کے لیے رونا پڑتا، یا شرکت سے انکار کر دیتی۔

ویسے بھی انتہائی تنگی کا زمانہ تھا۔ رولٹ ایکٹ کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا۔ گاندھی جی بہت جلد سولِ نافرمانی شروع کرنے والے تھے۔ بدیشی مال کا بائیکاٹ۔ چرخہ اور کھدّر کی تحریک نے عام بے چینی اور جوش و خروش پیدا کرنا شروع کر دیا تھا، اور رفیع بھائی اب جلد جلد

علی گڑھ سے آجایا کرتے تھے۔ گھر کے حالات نے شفیع صاحب کو مجبور کیا کہ وہ بی۔ اے کے بعد تعلیم چھوڑ دیں اور ملازمت کی کوشش کریں۔

ابّا جان نے اپنی دیرینہ خواہش کے مطابق انگریز حکّام سے درخواست کی اور ضلع کے انگریز کلکٹر نے ان کو ڈپٹی کلکٹری کے لیے نامزد کیا، لیکن خود ملنا ضروری سمجھا۔ شفیع صاحب چلے تو گئے، مگر وہ رسمیں بجا نہ لا سکے جو انگریز بہادر کے شایانِ شان تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نام کاٹ دیا گیا اور ابّا جان ہاتھ مل کر رہ گئے۔ رفیع بھائی سے مایوسی ہو ہی رہی تھی، یہ چوٹ اور پہنچ گئی۔ رفیع بھائی نے کچھ عرصہ پیشتر سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی میں شرکت کا ارادہ کیا تھا، جسے چچا نے یہ کہہ کر روک دیا تھا کہ اختتامِ تعلیم کے بعد جو چاہے کرنا اور اب وہ ایل۔ ایل۔ بی کر رہے تھے۔ لیکن حالات کا تقاضا کہ دو میں سے ایک کو کمائی کا کوئی راستہ نکالنا چاہیے۔ اس لیے شفیع صاحب نے کوآپریٹیو اسسٹنٹ رجسٹرار کی ملازمت قبول کر لی، اور چند ہی ماہ بعد اس سے استعفا دے کر دونوں بھائی کانگریس تحریک میں شامل ہو گئے۔

(۲۴)

شفیع احمد قدوائیؒ، رفیع صاحب سے دو سال چھوٹے اور مجھ سے تقریباً نو دس سال بڑے تھے۔ شکل و صورت میں بھی بڑے بھائیؒ

سے کافی مختلف تھے اور طبیعتاً بھی ذرا تیکھے مزاج کے تھے۔ رفیع بھائی جتنے گول مٹول تھے، یہ اتنے ہی دبلے پتلے اور لانبے۔ آخر عمر میں جسم بھاری پڑ گیا تھا۔ بہت ہی محتاط طبیعت کے انسان تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں رفیع بھائی کی حد سے بڑھتی ہوئی فضول خرچیوں اور فیاضیوں پر معترض بھی ہوتے تھے اور جب ان کی جیب خالی دیکھتے تو یہ بھی برداشت نہ ہوتا کہ ان کا ہاتھ پیسے کی کمی کی وجہ سے رُکا رہے۔ اس لیے اپنی پس انداز کی ہوئی رقم جو جیب خرچ سے بچ جاتی بھائی کو پیش کر دیتے تھے۔

۱۹۲۰ء میں انھوں نے بی۔اے کرنے کے بعد خاندانی حالات سے مجبور ہو کر آگے پڑھنے کا خیال چھوڑ کر ملازمت کی خواہش کی اور ابا جان (امتیاز علی) کی کوشش سے ڈپٹی کلکٹری میں نامزد ہوئے، مگر انگریز کمشنر سے ملاقات کے وقت وہ آداب و مراسم جو ان دنوں حکام کے لیے رائج تھے، بجا نہ لا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمشنر نے ناخوش ہو کر ان کا نام خارج کر دیا اور ان کے والد سے شکایت کی۔ ۱۹۱۹ء میں جب رولٹ ایکٹ کے سلسلے میں ہنگامہ شروع ہوا اور کانگریسِ تحریک نے نیا موڑ لیا، تو رفیع بھائی نے اپنے گانو اور ضلع میں کانگریس کا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ کچھ یہ خبریں بھی کمشنر تک پہنچیں۔ ابا جان اس ناکامیابی سے بہت متاثر ہوئے، مگر یہ دونوں بھائی خوش تھے کہ چلو جان چھوٹی۔

مگر حالات کا تقاضا تھا کہ ذریعۂ آمدنی کچھ ہو اس بیچ میں مجھ سے شادی بھی ہو گئی۔ آخر کار اسسٹنٹ کوآپریٹیو رجسٹرار کی پوسٹ مل گئی اور تقریباً ایک سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۲۱ء میں تحریک عدم تعاون (نان کوآپریشن) میں ملازمت سے استعفا دے کر شامل

ہو گئے۔

ان کے والد (ابا جان) اپنے لائق ترین بیٹوں کی اس نالائقی پر تلملا اُٹھے، لیکن وہ ایسے سخت گیر باپ تو نہ تھے کہ نوجوانوں کو اپنی مرضی اور اشارے پر چلانا ضروری سمجھتے ہوں۔ البتہ اپنی تکلیف خاندانی صورت حال، زمینداری کی ابتر حالت، سب کا تذکرہ کر کے انھیں روکنے کی کوشش ضرور کی۔ خود انھیں بیٹوں کی ان حرکتوں کی وجہ سے اپنی تحصیلداری بھی خطرے میں نظر آئی، مگر جوان بیٹوں کو جبراً اپنی رائے ماننے پر مجبور نہیں کیا، نہ انھیں گھر سے نکل جانے کو کہا۔ میں ۱۹۲۰ء میں اپنی عمر اس قابل نہ ہونے کے باوجود کانگریس کی ممبر بن چکی تھی اور ۱۹۲۱ء میں زنانہ کانگریس کمیٹیاں قائم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بلکہ اس سلسلے میں مسولی میں ایک بڑا جلسہ بھی کر ڈالا تھا۔ شفیع صاحب ملازمت چھوڑ کر آئے تو دل خوش ہو گیا۔ اب وہ بھی باقاعدہ ممبر تھے اور دسمبر ۱۹۲۱ء میں ستیہ گرہ تحریک میں حصّہ لیتے ہوئے گرفتار ہو گئے۔

دیہات سے ستیہ گرہی جتنے آتے تھے، ضلع کے صدر مقام بارہ بنکی میں گرفتاری کے لیے اپنے کو پیش کر دیتے تھے۔ اس سے پہلے علی گڑھ سے بار بار آ کر رفیع صاحب نے دیہات کا پیدل بیل گاڑی اور یکّہ پر مسلسل سفر کر کے یہ سب گانو آرگنائز کر دیے تھے۔ ضلع کے ساتھی ست پریمی جی وغیرہ ان کی آمد اور مشوروں کے منتظر رہا کرتے تھے۔

اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا جب میرے خاندان کے تقریباً دس بارہ افراد بیک وقت گرفتار ہو گئے۔ گرفتار ہونے والوں میں میرے دور رشتہ کے چچا ارشد علی اور نسیم احمد کے علاوہ خالو جان

نواب علی وکیل وراثت علی قدوائی کے والد ریاست علی، جو اپنے بزرگ رشتہ کے باوجود رفیع بھائی کے گہرے دوست بھی تھے، میرے ماموں جان، ایک رشتہ کے بھائی، غرض نوجوانوں کی اس گرفتاری کے بعد اب گھر میں صرف بڈھے دادا (ابا جان کے چچا) باقی تھے۔

ابا جان اپنی ملازمت پر شاید بجنور میں تھے۔ ظاہر ہے یہ خبر سن کر انھیں بہت شاک پہنچا۔ ان بچارے کو پتا بھی نہ تھا کہ گانو اور ضلع کے تمام نوجوان اک دم سرکارِ برطانیہ کے باغی بن جائیں گے اتفاق دیکھیے، اسی دن یا دوسرے دن میں ایک بچی کی ماں بن گئی میری اس نازک حالت کی وجہ سے شفیع صاحب پریشان تھے۔

لیکن ملازمت چھوڑنے پر انھوں نے کچھ رقم اس موقع کے لیے مخصوص کرکے رکھوادی تھی، اس لیے کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ یہ لڑکی مجھ سے صرف سولہ سال چھوٹی تھی۔ آزادی کی تحریک زور و شور سے چل رہی تھی، اس لیے میں نے اس کا نام آزادی رکھا۔

لیکن میری ماں کو یہ بھونڈا سا نام پسند نہ آیا اور انھوں نے اس کا عقیقہ رفیعہ سلطان پر کروایا۔ پڑھنے والوں کو تعجب ہوگا، اگر میں یہ بتاؤں کہ اس سے ایک سال پہلے پندرہ سال کی عمر میں بھی ایک کمزور ننھی بچے نے مجھ سے جنم لیا تھا، جو صرف چند دن دنیا کی ہوا کھا کر رخصت ہو گیا۔ اس کے مرنے پر میں بلا کچھ کہے سنے رو رہی تھی اور میری ماں مجھے تسکین و دلاسا دے رہی تھیں۔

ایک لیڈی ڈاکٹر جسے شفیع صاحب نے لکھنؤ سے بھجوایا تھا، ایسے وقت پہنچی جب میں پرانی دائی کا تختۂ مشق بن چکی تھی۔ ظاہر ہے اس کے بعد میری والدہ مجھے علاج کے لیے لکھنؤ لے گئیں اور ایک ماہ بعد جب صحت یاب ہوئی، تو پھر بالائے غم ہائے دگر میں گرفتار

ہو گئی۔ یہ سب میری رفتارِ طبیعت کے خلاف تھا۔ پہلے بچے کے لیے اس وقت نہ جانے کیوں آنسو نکلتے ہی چلے آرہے تھے۔ لیکن چند دن بعد میں اپنی دوستوں سے خوشی کا اظہار کرتی تھی کہ اچھا ہوا واپس چلا گیا، بیکار مجھے ستاتا۔

مگر شفیع صاحب جوان تھے۔ ان کے جذبات مجھ سے بالکل مختلف ہوتے تھے۔ میری سیاسی دلچسپیاں خاندان والوں کی نظر میں معیوب تھیں، لیکن شفیع صاحب ہمیشہ خوش ہوتے تھے۔ جب ودیشی کپڑے جلادینے کو کانگریس کا حکم ہوا تو میں نے آگ کے شعلوں میں شادی کا جوڑا بھی ڈال دیا۔ رفیع بھائی نے کہا، "شفیع کے کپڑے بھی لاؤ۔" اتفاق سے ان کا بھی شادی ہی کا جوڑا تھا۔ اُس وقت میری ماں رو دیں۔ ان کی نظر میں یہ بڑی منحوس بات تھی۔ اس وقت تک جیل سے متعلق بزرگوں کا نظریہ چوروں ڈاکوؤں والی جیل کا تھا، اس لیے بڑا رونا دھونا گھروں میں ہوا، سوا میرے گھر کے۔

(۲۵)

لکھنؤ جیل میں ان دونوں بھائیوں سے ملنے ہم لوگ گئے تو رفیع بھائی اور دوسرے اعزہ تو ملے، مگر شفیع صاحب نے خواتین سے ملنے سے انکار کر دیا۔ اتنا غصہ، ان کی اس حرکت

پر آیا ہے کہ نہ پوچھیے۔ کیا سمجھتے ہیں اپنے آپ کو۔ کیا میں انھیں یہاں دیکھ کر روؤں گی۔ بڑے دیش بھگت بنے ہیں۔

ان دنوں پردہ اور پرانی اقدار کے وہ اتنے حامی تھے کہ ایک وجہ نہ ملنے کی یہ بھی ہو سکتی تھی۔

جیل میں سیاسی قیدیوں کے اُن ابتدائی برسوں میں مزے تھے۔ سارے یارانِ نجد اکٹھے تھے۔ کسی کو شعر و شاعری سے دلچسپی تھی، کوئی اپنے گھریلو حالات کی فکر میں غلطاں و پیچاں، کسی کو بیوی بچّے یاد آ رہے تھے، کسی کو محبوبہ۔ نثار احمد شیروانی صاحب کو بیوی کی یاد بہت ستاتی تھی۔ اس لیے جیل کی بیرک میں جتنے کھپرے لگے ہوئے تھے گن ڈالے۔ یاد نہیں کتنے ہزار، کے سو تھے لیکن ہمارے بشیر چچا نے اس پر ایک شعر کہہ ڈالا تھا، وہ یاد رہ گیا۔

بیشتر شب کو رہا کرتا ہے تاروں کا شمار   دن میں زندان کے کھپروں کو گنا کرتے ہیں

مولانا آزاد سبحانی پابند شرع انسان تھے، اس لیے ان سر پھروں کو نماز روزے کی تلقین کیا کرتے۔

انھوں نے کہا بشیر میاں آپ اتنے اچھے آدمی ہیں، مگر نماز نہیں پڑھتے یہ بُری بات ہے۔

چچا نے کہا جب نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہوں، نہ جانے کہاں کہاں کے فضول خیالات اور یادیں گھیر لیتی ہیں۔ ایسی نماز سے کیا فائدہ؟

مولانا نے فرمایا، بھئی تم کو پان کھانے کی خواہش ہے۔ چند پیسے جیب میں ڈال کر پان لینے کے ارادہ سے گھر سے باہر نکلتے ہو، راستے میں بازار کی سجی سجی دکانیں پڑتی ہیں اور سامان پر نظر پڑتی ہے، مگر تمھارا مقصد پان خریدنا ہے، اس لیے سب کچھ دیکھتے ہوئے پان کی دکان پر چلے جاتے ہو اور خرید کر گھر واپس آتے ہو۔ بس ایسے ہی

نماز کو سمجھ لو۔ مقصد اصلی خدا کی بندگی و عبادت ہے۔ دنیا کی ہر فکر اور دلچسپی حارج ہوتی ہے تو ہونے دو۔ اپنا فرض بجا لاؤ۔ رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اور واقعی یہ نصیحت کارگر ہو گئی۔ وہ جب جیل سے لوٹے تو نماز کے پابند ہو چکے تھے۔ جیل میں مشاعرے بھی ہوتے۔ ہولی اور عید کے تہوار بھی منائے گئے۔ بھوک ہڑتال بھی ہوئی اور اکثر مقامات پر لاٹھی چارج بھی۔ قرقی بھی آئی۔ گھروں کا سامان بھی نیلام ہوا۔ یوں ہوتے ہواتے کسی کا سال کسی کے دو سال کٹ گئے۔ سب سے آخر میں رفیع بھائی چھوٹے۔

شفیع صاحب جیل سے لوٹے تو گھر کی مالی حالت بہت ہی سقیم ہو چکی تھی۔ جرمانے کی رقم تو کسی نے ادا نہ کی، مگر ابّا جان جنھوں نے ہمیشہ زمینداری سے بس اتنا ہی واسطہ رکھّا تھا کہ حسب ضرورت روپیا حاصل کر لیتے تھے، اور جب متفرق قرض بڑھ جاتا تو ایک دستاویز لکھ کر بڑا قرض لے کر اس کو ادا کر دیا کرتے تھے، بھائی کے انتقال کے بعد ان پر بوجھ بھی زیادہ ہو گیا تھا، ویسے تنخواہ نے آج تک کفالت کی نہ تھی۔

شفیع صاحب کچھ دن گھر ٹھہرے اور گھر کی ذمّے داریوں سے نپٹنے کی کوشش کی۔ چونکہ دونوں بھائی یہ سمجھتے تھے کہ ابّا جان کی مشکلات کے ذمہ دار وہ خود ہیں، اس لیے دونوں نے طے کر لیا کہ اپنی یا اپنے بیوی بچّوں کی ذمہ داری والدین پر نہ ڈالیں گے اور میری ماں اپنی ذاتی مختصر آمدنی میں مجھے بھی بدستور شامل رکھتی رہیں۔

شفیع صاحب پھر بمبئی چلے گئے، جہاں مولانا شوکت علی محمد علی سیٹھ عمر سبحانی وغیرہ کے ساتھ ایک سال کام کرتے رہے۔

بدقسمتی دیکھیے کہ انھیں دنوں میری والدہ سخت بیمار ہوئیں اور انھیں لکھنؤ بغرضِ علاج لے جانا پڑا۔ شفیع صاحب بھی بمبئی چھوڑ کر آ گئے۔

دونوں بھائیوں نے اتنی سخت تیمار داری دن رات کی کہ آج جب اپنی نا اہلی یاد آتی ہے، تو شرمندگی ہوتی ہے۔ ماموں جان لکھنؤ کے ہر مشہور ڈاکٹر و حکیم کی فکر میں دوڑتے۔ دوائیں بدلتی جاتیں اور مرض بڑھتا جاتا۔ آخر کار "الٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا" آخری وقت انھوں نے ہم دونوں بہنوں کو رفیع بھائی کے سپرد کیا اور کہا لڑکوں کی مجھے فکر نہیں، ان کے ابا جان ان کو سنبھال لیں گے۔

وہ چراغ بھی بجھ گیا، وہ روشنی بھی چلی گئی، وہ سہارا بھی منقطع ہو گیا، جس نے ۱۹۱۸ء سے لے کر ۱۹۲۴ء تک ہم سب بھائی بہنوں کی ڈھارس بندھائی۔ ہمیں ہمت و طاقت عطا کی تھی۔

اور اب میں تھی اور میرے چار چھوٹے بھائی بہن۔ ایک آٹھ سال کا تھا، بہن گیارہ کی تھی۔ دونوں دوسرے بھائی تیرہ چودہ کے تھے۔

(۲۶)

بچپن میں والد مرحوم کی سیاسی دلچسپیوں کی بدولت قومی تحریک میں شمولیت کی خواہش نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ لیکن

پرکٹے پرندے کی طرح گھر کے صحن میں چکر لگا لیتی تھی۔

البتہ جب رفیع بھائی مسولی آتے تو اس وقت سب نوجوان ان کے گرد جمع ہو کر ہندستان کے ہر مسئلے پر ان سے بات چیت کرتے اور انھیں اتھارٹی مانتے تھے۔ سودیشی تحریک شروع ہوتے ہی ایسا لگا جیسے گھروں میں بھونچال آگیا۔ جو حامی تھے وہ جی جان سے بائیکاٹ کو کامیاب بنانے میں جُٹ گئے، اور جو مخالف تھے وہ یا تو ان پاگلوں پر ہنستے یا پھر دشمنی میں اس حد تک آگے بڑھ جاتے کہ نوجوانوں کو گھر چھوڑ دینا پڑتا تھا۔ پروپیگنڈا مشینری کوئی اپنے پاس تھی نہیں، اس لیے محرّم کے علم کی طرح نوجوانوں کے غول قومی ترانے گاتے ہوئے، ترنگے جھنڈے اٹھائے ہوئے گانو گانو گلی گلی پھرنے لگے۔ قومی گیت اتنی کثرت سے لکھے گئے کہ شاعر کا نام معلوم کرنے کی بھی فکر نہ رہ گئی۔

عورتوں کا جوش و خروش مذہبی شغف لیے ہوئے تھا، بلکہ ہندو مسلم مردوں میں بھی "احیائے اسلام" اور ہندو دھرم کے نوجیون کی خواہش شدّت پکڑ گئی۔ ہندو مسلم ایکتا کے معنی تھے، انگریز سے تنفّر اور اس مشترکہ دشمن سے چھٹکارا۔ فرنگی محل و دیو بند کے علماء کی شرکت اور تحریک خلافت ترکی حکومت کے ساتھ۔ خانۂ کعبہ پر انگریزوں کی گولا باری سے غلافِ کعبہ کا جلنا، مسلمانوں میں پرو پگنڈے کا خاص جزو تھے۔ ان سب وجوہات نے مسلمانوں کو داڑھی، نماز اور فقیرانہ طرزِ حیات کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔

ہندوؤں کا مذہبی طبقہ مہا سبھا اور آریہ سماج کے بندھنوں میں بندھا ہونے کے باوجود ہندو ازم کو کانگرس کی تحریکِ آزادی کے ذریعے پھر زندہ کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

عورتوں نے اپنے گھونگھٹ، کڑے اور چھاگل اتار کر گاندھی جی کی صدا پر لبیک کہا۔ سب سے پہلے جن چند خواتین کے نام ہمارے دیہات تک پہنچے ان میں بیگم حسرت موہانی، بی اماں، کستوربا گاندھی اور مسز سروجنی نائیڈو کے تھے۔

عورتوں نے اپنے زیورات اور چھوٹی موٹی پس انداز کی ہوئی رقمیں مقامی کانگریس کمیٹیوں کو دان کر دیں۔ بدیشی کپڑوں سے اپنے بکس خالی کر کے ہر ضلع کے صدر آفس میں ہولی جلوا ڈالی۔ ان دنوں چیزیں کم تھیں مگر اعلا ہوا کرتی تھیں۔ اس لیے زردوزی کے ان کپڑوں سے اکثر منوں چاندی کانگریس کمیٹی کو ملی۔

بارہ بنکی میں جب بیل گاڑیوں اور رتھوں میں بھر کر بدیشی کپڑے نذرِ آتش ہوئے تو بیسوں پردہ دار خواتین نے بھی تانگہ اور یکوں پر پردہ بندھوا کر اپنے گانو محلّے سے بارہ بنکی کا سفر کیا۔ ان میں صرف دیہی خواتین تھیں، جو تحریک کے لیے چندہ جمع کرتیں چرخہ کاتتیں اور اپنے خاندان کے ویروں کی آرتی اتار کر جیل رخصت کرتی تھیں۔

مجھے وہ سین یاد ہے، جب ایک بڑے خیمے میں اردگرد پڑی ہوئی، چقوں سے جھانکتی ہوئی ہندو مسلم خواتین اِس ہولی کو جلاتے ہوئے جواہرلال کو دیکھنے کے لیے ایک پر ایک ٹوٹی پڑتی تھیں۔

اسٹیج پر جواہرلال جی، چودھری خلیق الزماں اور ہرکرن ناتھ مِصرا تھے، مگر خوبصورت نوجوان پنڈت جی موٹے کھدّر کی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ میں سارے مجمع کی توجّہ کا مرکز تھے۔

اندر عورتیں حسبِ عادت بول رہی تھیں۔ کسی نے کہا، دیکھو

تو کیسا موٹا کھدّر پہن کر آئے ہیں۔ شہزادوں کی طرح پلے ہیں ارے ان کے کپڑے تک تو پیرس میں دُھلتے تھے۔

ایک نے انکشاف کیا، ارے ان باپ بیٹے نے تو اپنے گھر کے بدیشی قیمتی برتن تک توڑ ڈالے۔

کسی اور طرف سے آواز آئی، یہ پورا خاندان تیاگ مورتی ہے میں ان سب کو نہیں جانتی تھی۔ صرف ٹھاکر رگھوناتھ سنگھ کی فیملی سے واقف تھی، جن کے بیٹے کے۔ڈی سنگھ بابو نے آگے چل کر مشہور ہاکی چیمپین کی حیثیت سے پریسیڈنٹ ایوارڈ حاصل کیا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس وقت یہ متفرق عناصر ایکتا اور پریم کی ڈوری میں بندھے، ایک ہی جذبے اور ایک ہی نشے سے سرشار تھے۔

مجھے اپنی تڑپ اور بے بسی بھی یاد ہے۔ نہ سفر کے قابل تھی، نہ تحریک میں شرکت کی اجازت، نہ جیل جانے کے لائق۔ دل پر پتھر رکھے گانو میں بیٹھی رہی۔ البتہ عورتوں میں کام شروع کر کے کانگریس پارٹی کا پہلا جلسہ مسولی میں کر ڈالا۔ ایک معمّر خاتون کو صدر بنا کر ضلع کے اور دیہات سے بھی خواتین کو مدعو کیا۔ اوٹ پٹانگ دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ اب وہ اندازِ بیان اور والہانہ جوش یاد کرتی ہوں تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے، مگر اس وقت رہ رہ کر اپنے اعزّہ پر اور خود شفیع صاحب پر غصّہ آتا تھا کہ مجھے کیوں نہیں جانے دیتے۔

کانگریس پارٹی کے جلسے کی ابتدا قرآن خوانی سے ہوئی حالانکہ بکثرت ہندو بہنیں بھی مجمع میں تھیں۔ یہ عہد بھی ہوا کہ ہم کوئی بدیشی چیز نہ استعمال کریں گے۔ چرخہ کاتیں گے۔

کانگریس کے پورے پروگرام کی کامیابی میں ساتھ دیں گے اور انگریز جب تک چلے نہیں جاتے، ہندستان آزاد نہیں ہو جاتا، چین نہ لیں گے۔ میری ماں کتنی اچھی تھیں۔ وہ ان تمام کاموں میں شریک رہیں۔ مخالفین کے اعتراض رد کرتے ہوئے، چندہ اکٹھا کرنے میں مدد کی۔ پیسا کہاں تھا، میرے پاس تو خود ان کا دیا ہوا زیور تھا اور جب میں نے وہ دیا، تو تکلیف کے باوجود خاموش رہیں۔

اب میرے پاس دوسرے دیہات سے بھی خبر آتی تھی کہ یہاں ممبر سازی ہوئی، کمیٹی بنی اور لوگ ستیہ گرہ کر کے جیل گئے۔

(۲۷)

اب سے پہلے صرف اعلا طبقے کی لیڈیز، ویمنس کانفرس، ویمنس لیگ ویمنس کلب وغیرہ کی ممبر ہوا کرتی تھیں۔ انجمن خواتین یا انجمن تہذیب نسواں کے نام سے بھی مقامی انجمنیں، عورتوں کی تعلیم (جسے ان دنوں تعلیم نسواں کہتے تھے) کے لیے کوششیں کر رہی تھیں، اور بہت ہی محتاط قسم کا سوشل ورک کیا کرتی تھیں۔

سیاست سے بس ان کا اتنا ہی تعلق تھا کہ محترم شخصیت کی موت پر تعزیتی ریزولیشن پاس کر دیں اور توہمات، بچپن کی شادی بُری بدیت رسموں کے خلاف اپنے اجتماع میں ایک قرار داد منظور کر لیں یا عورتوں کے حقوق پر بحث کر لیں۔ زیادہ تر ان کی سرگرمیاں بڑے

شہر میں چھوٹے چھوٹے اسکول قائم کرنے، زنانہ کلب قائم کرنے اور ڈنر پارٹیوں تک محدود تھیں۔

اس سلسلے میں لکھنؤ میں بیگم انعام حبیب اللہ اور اُن کی بہن بیگم شاہد حسین (جنرل حبیب اللہ کی والدہ)، چند رانیاں، عورتوں کے حقوق اور تعلیم نسواں کی زبردست حامی تھیں۔ منٹو مارلے اصلاحات کے تحت کچھ خواتین مقامی میونسپلٹی کی ممبر بھی بن چکی تھیں اس لیے انھیں زیادہ مواقع میسر آ گئے تھے۔

بیگم حبیب اللہ نے میونسپل بورڈ کی ممبری کے دوران شہر کے مختلف حلقوں میں چھوٹے چھوٹے سے بہت سے اسکول کھلوائے۔ دل کُشا کلب میں ایک بڑے سے بورڈ پر رانیوں اور بیگمات کے نام جنھوں نے کلب کے قیام میں مدد کی، آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

اس کلب میں مشاعرے بھی ہوتے تھے اور پردہ دار بیگمات بھی ہفتے میں ایک بار تشریف لاتی تھیں۔

احسان فراموشی ہوگی اگر ہم ان فیشن ایبل بہنوں کی درست کی ہوئی پگڈنڈی کو نظر انداز کر دیں یا اس کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کریں۔ یہ سراسر انگریزی تہذیب و تمدن کی عاشق خواتین اندر سے ہندستانی تھیں اور ہندستانی عورتوں کے جمود و بے حسی کو دور کرنے کے لیے کوشاں۔

کچھ بھی ہو انھوں نے جو آواز اُٹھائی، وہ اخبارات اور رسالوں کے ذریعے دیہات تک پہنچ گئی۔

تہذیب، عصمت، ظل السلطان، خاتون وغیرہ کئی رسائل کی مدیر بھی خواتین تھیں۔ انھوں نے اصلاحِ رسوم پر کتابیں لکھیں۔ ناول، شعر و ادب کا ذوق عورتوں میں پیدا کیا اور خیالات و عزائم کو

تحریری شکل دی۔ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ

اور

شوقِ تحریرِ مضامیں میں کھلی جاتی ہیں
بیٹھ کر پردے میں بے پردہ ہوئی جاتی ہیں

ان آزاد خواتین کی بے پردگی پر بھی انھوں نے اعتراض کیا۔

حامدہ چمکی نہ تھی اِنگلش سے جب بیگانہ تھی
اب چراغِ انجمن ہے جب چراغِ خانہ تھی

انھوں نے مردوں کو تنبیہ کی:

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی
تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک

ان اعلا طبقہ کی انگریزیت سے متاثر عورتوں تک مِڈل کلاس اور لوور کلاس کی عورتوں کی رسائی نہ تھی۔ یہ طبقہ نصیحت آمیز مضمون نگاری کر کے اپنی انا کو تسکین دے لیتا تھا۔ ان میں ایک 'بین' بھی تھی۔ مگر ستیہ گرہ کی شمولیت کے لیے جو عورتیں میدان میں آئیں وہ زیادہ تر متوسط اور غریب طبقہ کی تھیں۔ اس تحریک کے ساتھ ہی سیاسی اور مذہبی عناصر نے مل کر عورتوں میں دلیری، جوش، سیاسی سوجھ بوجھ اور ایثار کا جذبہ پیدا کر دیا۔ عطیہ فیضی انسویا سارا بھائی اور بہت سی خواتین کے ناموں سے

آشنا تھے۔ قومی تحریک کی ابتدا میں تو عورتیں بندھن توڑنے کی جان توڑ کوشش کرتی رہیں۔ زیادہ تر بزرگوں کی مخالفت نے ان کے قدم روک دیے۔ کم ہی کھل کر سامنے آئیں اور جیل گئیں۔ ان میں نہرو خاندان کی خواتین بھی تھیں۔ اس میں شک نہیں ان میں سے چند ہی سیاسی روتوں کا ساتھ دے سکیں۔ مگر در پردہ اپنے بیٹوں اور بھائیوں کی ہمت بندھانے میں انھوں نے قابل تعریف رول ادا کیا۔

وہ ایک ایسا دور تھا کہ ہندستان اس کے لیے بالکل تیار تھا کہ عملی جد و جہد عورتوں کی عزت و ناموس کو داؤ پر لگا دے بڑے بڑے ترقی پسند بھی عورتوں کو ناقص العقل اور نازک پھول سمجھا کرتے تھے۔ خود متوسط طبقہ کی عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہی تھی کہ وہ سیاسی زندگی میں کوئی مقام حاصل کر سکیں۔ دوسرے انھیں اپنے بچے بھی سنبھالنے تھے۔

مرد جیل چلے جاتے اور گھر بچوں کا سارا بوجھ عورت کے ہاتھوں پر پڑ جاتا تھا۔

ان دنوں انھوں نے مردانہ وار بچوں کی پرورش، لڑکیوں کی شادیاں تعلیم اور چرخے کی کتائی بدیشی مال کے بائیکاٹ وغیرہ کو اپنے سر لے کر بے مثال قربانی کا مظاہرہ کیا۔ مالی مشکلات نے کمر توڑ دی، لیکن انھوں نے ہمت سے سب کا مقابلہ کیا۔ قرقیاں، جائدادوں کی نیلامی، پولیس کی یورش، اعزہ کے اختلاف سب کا مقابلہ کیا اور یہ بات مردوں سے منوالی کہ قومی جد و جہد میں ان کا برابر کا حصہ رہا ہے۔ اگر وہ ان ذمہ داریوں کو اپنے سر نہ لیتیں تو مردوں کی ہمت پست ہو جاتی۔

عورتوں کو یہ احساس بھی ہوا کہ صرف سیاست ان کا

وہ بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ وہ ایک بار کسی کیس کے سلسلے میں بہ حیثیت جونیر وکیل بارہ بنکی بھی آئے تھے، اور لکھنؤ میں حسب معمول دونوں باپ بیٹے نسیم[1] صاحب ایڈوکیٹ کی طویل و عریض کوٹھی میں مقیم تھے۔

ڈالی باغ کی یہ کوٹھی اس دور کی تمام قابلِ ذکر ہستیوں کی میزبان ہوا کرتی تھی۔ نسیم صاحب نے سوال کیا، کہیے پنڈت جی آپ کا اپنے بیٹے کے متعلق کیا خیال ہے، کیا وہ بھی آپ کی طرح بڑا لاٹر بنے گا۔ موتی لال جی نے ایک لمحہ سوچا، پھر بولے۔ میرا بیٹا ممکن ہے بڑا وکیل نہ بن سکے، لیکن وہ بڑا آدمی تو ضرور بنے گا۔ یہ تھا اندازہ ایک باپ کا اپنے لڑکے سے متعلق اور کتنا صحیح اندازہ تھا۔

---

[1] پروفیسر محمد مجیب و پروفیسر حبیب کے والد

(ناتمام)

مضامین